S. No. 10

ISSN : 2394-5567

سہ ماہی ادبی جریدہ

جلد : چہارم

شمارہ: اول

دبیر

جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء

مدیر

احمد نوید یاسرؔ ازلان حیدرؔ

DABEER January to March 2017 No. 10

ISSN : 2394-5567

S. No. 10

DABEER

Volume : 4

Issue No. : 1

(An International Peer Reviewed Quarterly Literary Refereed Journal)

January to March 2017

Editor:-

Ahmad Naved Yasir 'Azlan Hyder'

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان.....

سہ ماہی ادبی جریدہ۔

دبیر

جلد۔۴ شمارہ۔۱

جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔ چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ مقالہ نگاروں سے گزارش:۔ حواشی مقالہ کے آخر میں لکھیں، مآخذ کے حوالہ جات اس ترتیب میں ہوں:۔ مصنف یا مولف، کتاب کا نام جلد، مقام اشاعت، سن اشاعت، صفحہ نمبر۔

اپنے مقالے اردو ان پیج، یا ایم ایس ورڈ کی فائل میں ہمارے برقی پتے پر ارسال کریں۔ مقالہ کے ساتھ چکیدہ وکلیدی الفاظ ضرور لکھیں۔

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی
ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی
سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر محمد اقبال شاہد
ڈین فیکلٹی آف لینگویجیز اسلامک
واورینٹل لرننگ، جی سی یو، لاہور، پاکستان

پروفیسر ابوموسیٰ محمد عارف باللہ
ڈایریکٹر البیرونی فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر عبدالقادر جعفری
سابق صدر شعبۂ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور
پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، صدر شعبۂ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ
پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد
ڈاکٹر محمد عقیل، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی
ڈاکٹر محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
ڈاکٹر محمد توصیف، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
ذوالنورین حیدر علوی، مدیر شش ماہی ''تصفیہ'' کاکوری، لکھنؤ
سید نقی عباس کیفی، مدیر سہ ماہی ''نقد وتحقیق'' دہلی
ارمان احمد، مدیر سہ ماہی ''عرفان'' چھپرا، بہار

☆معاون مدیر☆

عاطفہ جمال
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

☆مجلس مشاورت☆

پروفیسر عمر کمال الدین، شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
پروفیسر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال
پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام
پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد
پروفیسر وجیہ الدین، شعبہ عربی وفارسی، بڑودا یونیورسٹی، بڑودا، گجرات
پروفیسر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
پروفیسر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی
پروفیسر عبدالحلیم، صدر شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
پروفیسر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور
ڈاکٹر صالحہ رشید، صدر شعبہ عربی وفارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ
ڈاکٹر عطا خورشید، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ
ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی، یوسف اسلام کالج، جوگیشوری، ممبئی
ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، مسٹن گنج، رامپور
ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، کرامت گرلس کالج، لکھنؤ
ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، مانو، حیدرآباد
ڈاکٹر نکہت فاطمہ، شعبہ فارسی، مانو، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ
ڈاکٹر شبیب انور علوی، شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، حیدرآباد، تلنگانہ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	اداریہ	ازلان حیدر	۴
☆	**مقالات**		
۲۔	احمد علی سندیلوی صاحب مخزن الغرائب: ایک تعارف	پروفیسر عارف نوشاہی	۵
۳۔	شاہجہانی دسترخوان کے ذائقے	پروفیسر علیم اشرف خاں	۹
۴۔	گلستان سعدی کی مقبولیت کا راز	پروفیسر طاہرہ وحید عباسی	۱۶
۵۔	حدیث ہندوستان و نطق دو دلدادگان	پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید	۱۹
۶۔	میرِ کاروانِ تحقیقِ فارسی: صباح الدین عبدالرحمٰن	پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی	۳۰
۷۔	کشمیر میں عصر حاضر کا فارسی شاعر: انیسؔ کاظمی	پروفیسر عزیز عباس/ ڈاکٹر محمد الطاف بٹ	۴۴
☆	**میراث خطی**		
۸۔	''قران السعدین'' کی شرح کے ایک خطی نسخے کا تعارف	پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی	۵۰
۹۔	دیوان فطرتؔ کے اہم خطی نسخے	مناظر حق	۵۷
☆	**دکنیات**		
۱۰۔	اسٹیٹ میوزیم میں قرآن کریم کے اہم مزین نسخے	سید عادل احمد	۶۳
	آئینۂ تحقیق		
۱۱۔	اشاریہ (دبیر ۲۰۱۶ء)	عاطفہ جمال	۶۷
☆	**چشم بینش**		
۱۲۔	نفائس الانفاس ترجمہ شبیب انور علوی: جائزہ	ازلان حیدر	۷۱

English Aritcles:

1. Spread of Sufism in Indonesia
Dr. Pradeep Tandon 3

2. Tagore and Iqbal: Purushottama and Mard-e-Kamil
Dr. Salina Begum Laskar 16

اداریہ

اسلامی تعلیم وتہذیب وتمدن کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بہت سے فنون ایسے نظر آئیں گے جو صرف علم سے ہی منسلک ہیں انہیں میں ایک فن خطاطی بھی ہے اس فن کی ابتداء کے شواہد بھی ظہور اسلام سے ہی ملتے ہیں اور اس فن کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ بھی مسلمانوں کی آمد کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہی پائی جاتی ہے۔فن خطاطی کی شروعات ہندوستان میں بڑے شاندار طریقہ سے ہوئی اور ترقی بھی خوب ہوئی شاہوں سے لیکر عام انسانوں تک نے اس فن میں اس قدر دلچسپی لی کہ فن بہت کم مدت میں تمام ہند میں پھیل گیا اور آج بھی ہم اس فن کے نمونے پرانی عمارتوں، کتابوں، مخطوطوں، اسلحوں، سونے چاندی کے سکوں اور برتنوں پر دیکھ سکتے ہیں۔خطاطی میں جو مختلف خطوط زیادہ مستعمل ہیں ان میں کوفی، نسخ، نستعلیق، ثلث، گلزار، بہار اور شکستہ مشہور ہیں۔ جہاں ایک طرف ان تمام خطوط کی الگ الگ پہچان اور الگ الگ انداز ہے وہیں ہر خط میں الگ الگ حسن ونکھار بھی پایا جاتا ہے۔آج ہمارے لئے جہاں ایک طرف یہ ضروری ہے کہ اس گراں قدر فنی وادبی سرمایہ کی حفاظت کی طرف توجہ دیں وہیں جو حضرات اس ناقدری کے دور میں اس فن سے منسلک ہیں اور بلا کسی معاوضہ وتشہیر کے فقط شوق وتسکین قلب کے لئے اس فن کو باقی رکھے ہوئے ہیں اور اپنی فنکاری کے ذریعہ اسے بقائے دوام عطا کرنے کی حتی الامکان کوشش کررہے ہیں ان کی طرف توجہ کرکے انہیں ادبی دنیا میں روشناس کرانے کی کوشش کریں تاکہ عہد حاضر میں بھی یہ فن شاندار ماضی کی طرح ادب سے منسلک ہوسکے۔فن خطاطی پر طویل گفتگو کا مقصد یہ کہ چند سال قبل میری ملاقات عہد حاضر کے مشہور خطاط جناب احرار ہندی سے ہوئی ان کی خطاطی کے تمام نمونوں میں فارسی کے اشعار و مقولے مستعمل ہیں مگر عام طور پر فارسی زبان وادب کے طلباء نیز اساتید بھی اس بات سے ناواقف ہیں کہ یہ فن آج بھی ہندوستان میں احرار ہندی کی کاوشوں سے اپنے حسن کے جلوے بکھیر رہا ہے۔ بہرکیف ہمارے اساتذہ کی دعاؤں سے جریدہ کی تیسری جلد کی تکمیل کے بعد چوتھی جلد کی ابتداء کی صورت میں یہ پہلا شمارہ آپ حضرات کی نظروں کے سامنے ہے اور مشورۂ اساتذہ کے بعد اس جلد کے ہر شمارے کا کور جناب احرار ہندی کی خطاطی کے نمونے کے ساتھ ڈیزائن جائے گا تاکہ جریدہ کی خوبصورتی میں بھی اضافہ ہو اور فنکار سے فارسی زبان وادب کے تمام لوگ واقف بھی ہوسکیں۔

ازلان حیدر

پروفیسر عارف نوشاہی
پاکستان

احمد علی ہاشمی سندیلوی صاحبِ مخزن الغرائب: ایک تعارف

چکیدہ: احمد علی ہاشمی سندیلوی بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری /انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستانی شاعر اور تذکرہ نویس گذرے ہیں۔ان کی شہرت ان کے تصنیف کردہ فارسی گو شعرا کے تذکرے مخزن الغرائب کی وجہ سے ہے جو تین ہزار سے زائد شعرا کا تذکرہ ہے۔۔وہ خود بھی شاعر تھے اور ''خادم'' تخلص کرتے تھے۔

کلیدی الفاظ: سندیلہ، احمد علی خادم ہاشمی، مخزن الغرائب، ہندوستانی فارسی ادب

احمد علی ''خادم'' ہاشمی سندیلوی (یا سندیلی) بن غلام محمد بن مولوی محمد حاجی، ہندوستانی فارسی شاعر اور تذکرہ نویس گذرے ہیں۔ان کا مولد اور وطن سندیلہ، ریاست اتر پردیش میں لکھنو سے کچھ فاصلے پر ہے۔

احمد علی ۱۲۱۷ھ /۱۸۰۲ء میں مخزن الغرائب کی تصنیف میں مصروف تھے (احمد علی، بذیل غلام فخر الدین خان حیرت و جواہر لال دبیر) اور مخزن الغرائب کے دیباچے میں وہ اپنی عمر ۵۴ سال بتاتے ہیں (احمد علی، ۱/۶)، اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۱۶۳ھ /۱۷۵۰ء کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے۔مخزن الغرائب کے نسخۂ باڈلیان کی تاریخ کتابت ۱۱ صفر ۱۲۲۴ھ /۱۸۰۹ء ہے اور کاتب ایسری پرشاد کایتھ نے ترقیمے میں مصنف کے نام کے ساتھ ''دام افضالہٗ'' کے دعائیہ کلمات لکھے ہیں جو اس بات کا قرینہ ہے کہ احمد علی مذکورہ تاریخ تک بقید حیات تھے۔ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

احمد علی کے دستیاب حالات وہی ہیں جو انھوں نے دیباچۂ مخزن الغرائب میں تحریر کیے ہیں۔اس تحریر کے مطابق انھوں نے عہد طفولیت میں ہی اپنے والد کی بے سروسامانی کی وجہ سے اپنے وطن کو خیر آباد کہہ دیا اور غریب الوطنی کے شکار ہوئے۔پھر شہید نواب عزت الدولہ میرزا احسن سہراب جنگ بن میرزا محمد محسن برادر کلانِ نواب صفدر جنگ کی خدمت میں پہنچے۔انھوں نے نواب ذوالفقار الدولہ بن میرزا نجف خان (وفات: ۱۱۹۶ھ /۱۷۸۲ء) کی ملازمت میں بھیجا جن کے وسیلے سے احمد علی، شاہ عالم ثانی (عہد ۱۱۷۳-۱۲۲۱ھ /۱۷۵۹-۱۸۰۶ء) کی فوج میں میں داخل ہوئے۔فوجی خدمت پر مامور ہو کر دہلی پہنچے۔اسی شہر میں ان ایرانیوں کے ساتھ جو خراسان، عراق و فارس سے ہندوستان آئے تھے اور دہلی میں

اقامت پذیر تھے، نشست و برخاست رکھی اور ان سے فارسی محاورات سیکھے اور اپنی فارسی دانی کو مضبوط کیا۔ میرزا محمد حسن قتیل لاہوری (وفات: ۱۲۴۰ھ/۲۵-۱۸۲۴ء) کو وہ اپنا استاد کہتے ہیں (احمد علی، ۱/۱-۸)۔

احمد علی کو عنفوان شباب سے ہی شعر گوئی سے دلچسپی تھی (ایضاً، ۱/۶؛ ۳/۲۰۵)۔ وہ اشعار میں ''خادم'' تخلص کرتے تھے اور اسی کے تحت انھوں نے اپنا ذکر مخزن الغرائب میں کیا ہے اور قریباً چالیس متفرق اشعار بطور نمونۂ کلام درج کیے ہیں (ایضاً، ۲/۱۳۳-۱۳۷) ان کا اکثر شعرائے ہند و ایران جیسے محمد حسن قتیل لاہوری، انشاء اللہ خاں انشاء دہلوی، حیرت مشہدی، ربیع خوانساری، حافظ ابراہیم شیرازی صبوری، مرزا باقر اصفہانی اور سید مظہر علی صافی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اور اس کا ذکر انھوں نے مخزن الغرائب میں کیا ہے (ایضاً: ۱/۲۸۵، ۸۵۹-۸۶۱؛ ۲/۳۷۷؛ ۳/۱۸۵-۱۸۶، ۲۰۰، ۲۰۵؛ ۴/۵۷۰)۔ احمد علی کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی اطلاع فراہم نہیں ہوتی۔

تصانیف:

۱۔ **مخزن الغرائب:** یہ کتاب انھوں نے ۵۴ سال کی عمر میں قتیل لاہوری کے تحریک پر تالیف کی اور انھی کی تجویز پر اسے شعرا کے تخلص کی الفبائی ترتیب کو مدنظر رکھ کر مدوّن کیا (احمد علی، ۱/۸-۹)۔ اس کی تکمیل کا سال ۱۲۱۸ھ/۴-۱۸۰۳ء ہے۔ اس میں فارسی کے ۳۱۴۸ قدیم، متاخر اور معاصر شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔ تہجی ترتیب کے مطابق پہلے شاعر، ابوسعید ابوالخیر اور آخری شاعر، یوسف بیگ بخارائی ہیں۔ شعراء کی تعداد کے اعتبار سے تذکرۂ آفتاب عالمتاب اور صحف ابراہیم کے بعد یہ تیسرے مقام پر فائز ہے۔ مصنف نے اس تذکرہ میں ۲۱ کتابی مآخذ کے علاوہ قتیل اور دوسرے دوستوں کی زبانی روایتوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مصنف نے اس تذکرے میں کوشش کی ہے کہ ایسے اشعار کا انتخاب دیا جائے جو عاشقانہ، صاف، رواں، قریب الفہم اور سہل ممتنع ہوں (احمد علی، ۱/۱۲)۔ حالات کے اندراج میں کہیں کہیں مصنف نے سہل انگاری کی ہے اور دقّت نظر سے کام نہیں لیا مثال کے طور پر قدسی مشہدی (احمد علی، ۴/۵۳۴-۵۳۵) کے حالات میں تسامحات موجود ہیں (گلچین معانی، ۲/۱۸۰-۱۸۲)۔ مصنف نے جا بجا شاعروں کے بارے میں اپنے تنقیدی نظریات بھی پیش کیے ہیں (احمد علی، ۲/۶۵۶ ذیل حالات سرخوش)۔ یہ تذکرہ ڈاکٹر محمد باقر [۱۹۱۰-۱۹۹۳ء] استاد ادبیات فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے اہتمام سے ۵ جلدوں میں پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ شایع شدہ جلدوں کی ترتیب یوں ہے:

جلد اول (الف-ح)، ۱۹۶۸ء، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۸۸۴ص۔

جلد دوم (خ-ش)، ۱۹۷۰ء، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۰۵۸ص۔

جلد سوم (ص-غ)، ۱۹۹۲ء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۵۱۰ص۔

حرف عین اور غین کے کچھ شعرا جلد چہارم میں بھی ہیں۔

جلد چہارم (عبدالعلی یزدی-محمد خراسانی)، ۱۹۹۳ء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۹۲۰ص۔

جلد پنجم (محمد تبادکانی-یوسف بیگ بخارائی)، ۱۹۹۴ء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۸۴۷ص۔

ڈاکٹر محمد باقر نے اپنے دیباچے میں مخزن الغرائب کے باڈلیان، خدابخش بانکی پور، برٹش میوزیم، پنجاب یونیورسٹی لاہور، اعظم گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور رضا رامپور کے خطی نسخوں کا ذکر کیا ہے اور اپنے کام کی بنیاد ذخیرۂ شیرانی پنجاب یونیورسٹی کے ایک نسخے مکتوبہ ۱۲۱۹ھ بمقام لکھنو پر رکھی ہے اور باڈلیان، برٹش میوزیم اور علی گڑھ کے نسخوں سے تقابل کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے جا بجا توضیحی حواشی کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ان کا ارادہ کتاب کی آخری جلد کے ساتھ اشخاص، مقامات اور کتب کا اشاریہ لگانے کا تھا جیسا کہ انہوں نے پہلی جلد پر اپنے دیباچے کے آخر میں لکھا ہے۔ لیکن تذکرے کی اشاعت کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ہو پائی اور آخری تین جلدوں کے ناشر نے ہر جلد کے آخر میں صرف شعرا کی ایک الفبائی فہرست دینے پر اکتفا کیا ہے۔

۲۔ **انیس العاشقین**: اس کتاب میں شاعروں کے حالات زندگی اور عاشقانہ فارسی شاعری کے نمونے دیے گئے ہیں۔ مصنف نے اس کی تدوین میں چند قدیم بیاضوں اور تذکروں سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ذخیرۂ شیرانی پنجاب یونیورسٹی، لاہور (شمارہ 4523/1473) میں موجود ہے (بشیر حسین، ۱/ ۹۳)۔ یہی بیاض بعد میں مخزن الغرائب کی شکل اختیار کر گئی یا یوں کہیے کہ مخزن الغرائب کا ایک اہم مأخذ انیس العاشقین ہے (محمود شیرانی، ۱۹۲/۹)۔

بیل نے احمد علی کا ذکر دو جگہ کیا ہے۔ پہلے احمد علی ہاشمی کے تحت اور پھر اس کے تخلص ''خادم'' کے تحت۔ پہلے مقام پر اس کی تصنیف مخزن الغرائب کا ذکر کیا ہے اور دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ وہ متعدد کتب کے مصنف ہیں [ہمیں ان متعدد تصانیف کا علم نہیں ہے۔ عارف] جن میں سے ایک انیس العشاق ہے (Beale,37,210)۔ بیل نے پہلے اندراج میں احمد علی کے والد کا نام نہیں لکھا لیکن دوسرے اندراج میں محمد حاجی کو ان کا والد بتایا ہے۔ بیل نے خادم کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں شہرت پائی یا وہ جوان تھے۔ (He flurished about the year A.D.1752,A.H1165)۔ معلوم ہوتا ہے بیل کو کچھ سہو ہوا ہے۔ اولاً محمد حاجی، احمد علی کے دادا تھے والد نہیں، ثانیاً احمد علی ۱۱۶۵ھ میں کیسے جوان ہو سکتے ہیں یا ۱۱۶۵ میں ان کی شہرت کیسے ہو سکتی ہے؟ احمد علی تو ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ہمیں انیس العشاق نام سے ایک اور کتاب بھی ملتی ہے جس کے مصنف حافظ خادم علی کیتھلی ہیں (سامی، ۲۰۰۸/۳؛ خیام پور، ۱۸۰)۔

مخزن الغرائب اور انیس العاشقین کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: مظہر محمود شیرانی، ۱۱۰؛ علی رضا نقوی: ۴۹۴-۴۹۹؛ Ethe,395

نمونۂ کلام:

ما بر مراد خود نہ چو پروانہ سوختیم — خادم بیا کہ بی تو غریبانہ سوختیم
دل را عبث بہ مہر بتی دادہ ایم ما — قندیل کعبہ وای بہ بت خانہ سوختیم
بردند رہ بہ محفل عیش تو ناکسان — ما بیکسان بہ گوشۂ ویرانہ سوختیم
در دہر کس نماند کہ آن را نسوخت عشق — ما نیز در ہوای تو بیجا نسوختیم
ما را بہ بلبل ای گل ناز آفرین مسنج — اوخانہ ساز آمد و ما خانہ سوختیم
خادم بہ دَیر چون بت خود را نیافتیم — آتش چنان زدیم کہ بت خانہ سوختیم

(احمد علی، ۱۳۷/۲)

احمد علی ہاشمی سندیلوی کے ایک ہم نام اور ہم وطن معاصر قاضی احمد علی سندیلوی کثیر التصانیف مصنف گذرے ہیں۔ جنھوں نے بارہویں صدی ہجری کے آخر میں رحلت کی۔ ان کی زیادہ تر تصانیف علم منطق پر کتب کے حواشی کی صورت میں ہیں (رحمان علی، ۲۰)۔

کتابیات:

احمد علی ہاشمی سندیلوی، مخزن الغرائب، بہ اہتمام محمد باقر، لاہور/اسلام آباد ۱۹۶۸-۱۹۹۳ء
بشیر حسین محمد، فہرست مخطوطات شیرانی، لاہور، ۱۹۷۵ء
خیام پور، عبدالرسول، فرہنگ سخنوران، تبریز، ۱۳۴۰ش
رحمان علی، محمد عبدالشکور، تذکرہ علمای ہند، لکھنو، ۱۹۱۴ء
سامی، شمس الدین، قاموس الاعلام، استانبول، ۱۳۰۸ھ
علی رضا نقوی، تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان، تہران، ۱۳۴۳ش
گلچین معانی، احمد، تاریخ تذکرہ ہای فارسی، ۱۳۳۶ش
محمود شیرانی، حافظ، مقالات حافظ محمود شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، لاہور، ۱۹۹۹ء
مظہر محمود شیرانی، ''تذکرہ مخزن الغرائب و انیس العاشقین''، تحقیق، جام شورو، ۱۹۹۲ء، شمارہ ۶

Beale, T.W., *An Oriental Biographical Dictionary*, New York, 1980;

Ethe,H.*Catalogue of the Persian Manuuscript in the Bodleian Library*, Oxford, 1989.

(وضاحت: یہ مضمون پہلی بار فارسی میں دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، تہران، ۱۳۷۵ شمسی/۱۹۹۶ء، جلد ۷، ص ۷۵-۷۶ میں شایع ہوا تھا۔ اب اس کا اردو ترجمہ، نظر ثانی اور کئی اضافات کے بعد یہاں شایع کیا گیا ہے۔ عارف نوشاہی، ۲۸ جنوری، ۲۰۱۷ء)

☆☆☆

پروفیسر علیم اشرف خان
صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

شاہجہانی دسترخوان کے ذائقے

چکیدہ: فارسی زبان مختلف علوم و فنون کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اس زبان میں تقریباً ہر موضوع پر تصانیف لکھی گئی ہیں لیکن ان میں سے بہت سی کتابیں بڑے ہی دلچسپ موضوع پر ہونے کے باوجود کئی وجوہات کی وجہ سے منظر پر نہیں آپاتیں مثلاً مصنف کے متعلق معلومات، کاتب، سال کتابت، واحد نسخہ یا نامکمل نسخہ۔ عہد شاہجہانی کے پکوان پر لکھا گیا ایسا ہی نسخہ زیر بحث ہے جس میں در استعمال نانہا، در استعمال آشہا، در انواع زیر بریان جیسی اقسام ترتیب دی گئی ہیں اور مختلف پکوان کے بنانے کے طریقہ بھی بتائے گئے ہیں۔

کلیدی الفاظ: نسخے، قسم، پختن، سامان، پلائو، بریان، گوشت، آش، انواع گھی، بگھار، مغز بادام

ابتدائے تاریخ سے ہندوستان نے دنیا کو بہت کچھ دیا اور دنیا سے بہت کچھ لیا۔ گویا ہر اچھی اور کارآمد عادت، بات، زبان، رسم ورواج، رہن سہن اور سماجی وثقافتی میدان کے تمام کارہائے نمایاں زمرے میں شامل ہیں جس کے باعث ہندوستان مختلف تہذیبوں اور ثقافت وتمدن کا سنگم بن کر ابھرا جس کی ممتاز خصوصیت کثرت میں وحدت کہی جاتی ہے۔ ہندوستان میں آنے والے صوفیاء عرفا سے یہاں کے عوام نے کسبِ فیض کیا اور حکمراں وامرا و بادشاہوں کے دئے ہوئے مختلف تحفوں کو قبول کیا اور انہیں زندگی میں بروئے کار لاکر یہ ثابت کردیا کہ ہندوستانیوں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

مقالے کا عنوان ''شاہجہانی دسترخوان کے ذائقے'' ہے جس کے لئے سالار جنگ میوزیم اور لائبریری کے ایک قلمی نسخے ''دستور پختن اطعمہ'' کا تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔

یہ قلمی نسخہ ''طباخی'' عنوان کے تحت نمبر شمار 4284/4 پر محفوظ ہے جس میں کل اوراق کی تعداد 38 ہے جو عام نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے۔ ہر صفحہ پر 12 سطریں ہیں اور صفحے کا سائز 13.6x23.1 سینٹی میٹر ہے اس میں دو مہریں موجود ہیں جو تیرہویں صدی ہجری کا کتابت شدہ ہے۔ قلمی نسخے کا آغاز اس طرح ہے:

''یا فتاح، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم دستور پختن اطعمہ کہ در سرکار پادشاہ شاہجہان معہ وزن بہ عمل می آمد ودہ قسمت اختتام یافت''۔

قلمی نسخے کا انجام یوں ہے:

''ہمراہ لعاب بادام درنخودی دہند چون چون خشک شود بر روغن نیامد بدستور بالکرہی پولاو برگیرند شکر چینی لیموں تمت تمام شد''۔

اس قلمی نسخے میں دس قسمیں بیان کی گئی ہیں جو شاہجہانی عہد کے مقبول ترین کھانے اور ذائقے تھے انہیں دس ابواب میں علاحدہ عنوان سے اس طرح درج کیا گیا ہے:

۱۔قسم اول: در استعمال نانہا، ص ۱۔۷

۲۔قسم دوم: در استعمال آشہا، ص ۷۔۱۲

۳۔قسم سوم: در استعمال قلیہ ہاودو پیازہ ہا، ص ۱۲۔۳۶

۴۔قسم چہارم: در انواع بھرتہا، ص ۳۶۔۴۳

۵۔قسم پنجم: در انواع زیر بریان، ص ۴۳۔۴۷

۶۔قسم ششم: در انواع پولاوہا، ص ۴۷۔۶۷

۷۔قسم ہفتم: در انواع کوفتہ ہاو کباب ہا یخنی ہا

۸۔قسم ہشتم: در پختن ہریسہ ہاوخاکینہ ہاوسموسہ ہاو پوری وغیرہ انواع شیرینی

۹۔قسم نہم: در انواع شولہ کھچڑی وغیرہ

۱۰۔قسم دہم: در انواع مربّہا وغیرہ

قسم پختن نان بادامی

بادامی نان پکانے کا طریقہ کچھ یوں ہوا ہے:

سامان: بادام کا مغز، مصری، روغن زرد، انڈے کی سفیدی وغیرہ

سب سے پہلے بادام کے مغز کا چھلکا اتار کر اس کو باریک کر لیں۔ مصری کے شیرے میں آٹا ڈال کر آگ پر رکھیں اور اسے چمچے سے چلاتے رہیں جب وہ اکٹھا ہو جائے تو اس میں پسا ہوا مغز بادام اور انڈے کی سفیدی کو گھی کے ساتھ ملائیں اور جب پورا پکا ہوا نہ ہو اسی وقت اتار لیں اور اسے روٹی کی باریک کاغذ پر رکھیں جس طرح خطائی نان بنائی جاتی ہے اور اسے اوپر نیچے دونوں طرف سے دھیمی آنچ پر رکھیں۔ (ورق ۲ب)

آش چاشنی دار

سامان: گوشت، روغن زرد، بتاشہ، آب لیموں، میدہ، مصالح دو پیازہ، نمک وغیرہ

پہلے گوشت کو دو پیازہ کر کے مصالحوں سے مرغن کر کے تیار کریں اس کے بعد بتاشے کا شربت کر کے شیرہ میں لیموں کا رس ملا دیں اور دو پیازہ میں ڈال کر پکائیں لیکن زیادہ پانی نہ ڈالیں کہ قلیہ کی طرح ہو جائے مگر تھوڑا پانی ضرور رہے اس کے بعد میدہ کو گوندھ کر اس کے چھوٹے ٹکڑے کپڑے میں باندھ کر گرم پانی میں ۳ یا ۴ مرتبہ غوطہ دیں اس کے بعد اسے گوشت میں ڈال کر اسے ایک جوش کے بعد تار لیں اور استعمال کریں۔ (ورق ۳۔الف وب)

قسم پختن قلیہ ملغوبہ

سامان: گوشت، روغن زرد، جغرات (دہی)، دار چینی، الائچی، لونگ، مرچ پسی ہوئی، ادرک، کشنیز (دھنیا)، اور نمک۔

سب سے پہلے گوشت کو پیاز اور گھی میں نمک اور کشنیز ملا کر مصالحے کے ساتھ دو پیازہ کر لیں جب بادامی رنگ ہو جائے تو جغرات کو لیموں اور چاول کو دودھ کے ساتھ پوٹلی بنا کر دو پیازہ میں ڈال دیں اور اسے جوش دیں جب اس کا لعاب بن جائے تو دیگ دان سے باہر نکال لیں۔ (ورق ۷۔الف)

قسم پختن دو پیازہ شیرازی

سامان: گوشت، روغن زرد، انڈا، زعفران، دار چینی، لونگ، الائچی، مرچ، خوبانی، کشمش، مغز بادام، مغز پستہ، ادرک، کشنیز اور نمک

پہلے گوشت کو روغن زرد میں پیاز کے ساتھ بادامی کر لیں جب وہ نرم ہو جائے تو اس میں میدہ ملا دیں جب تیار ہو جائے تو اس میں تھوڑا پانی ملائیں اور کچے انڈے کا لعاب دو پیازہ میں ملائیں اور ہلکی آنچ پر رکھیں جب بھی پک جائے تو اس میں مصالحے اور لیموں ملا کر استعمال کریں۔ (ورق ۱۵۔ب)

قسم پختن بھرتہ گوشت

سامان: مچھلی کا گوشت، روغن زرد، دار چینی، لونگ، الائچی، مرچ ادرک، پیاز، کشنیز اور نمک

پہلے مچھلی کے گوشت کو صاف کر کے اس کے چھوٹے ٹکڑے کرنے کے بعد چھری کی نوک سے اس کے گوشت کو ہلکا کوٹ کر اس میں ادرک کا پانی اور نمک ڈالا جائے اور اسے چار گھڑی تک چھوڑ دیں اس کے بعد کشنیز کو اس میں ملا کر پھر اس کو چار گھڑی چھوڑ دیں اور پیاز کو بریان کر کے اس گوشت کو بھون لیں اس دوران اسے مسلسل الٹتے پلٹتے رہیں اور مصالحہ ملا کر باہر نکال لیں اور استعمال کریں۔ (ورق ۲۰۔الف)

قسم پختن زیر بریان خراسانی

سامان: چاول، گوشت، روغن زرد، دارچینی، الائچی، زعفران، جغرات پیاز، کشنیز، نمک، کالا زیرہ، کالی مرچ اور لونگ

سب سے پہلے گوشت کو نمک اور ادرک کے جوس میں ملا کر دو گھڑی انتظار کریں اس کے بعد الائچی اور زعفران کو مرچ اور کشنیز کے ساتھ جغرات میں ملا کر گوشت پر ملیں اور دیگ میں زیرہ ڈال کر گوشت کو الٹا پلٹا کریں یا چلائیں اور دارچینی، لونگ کو اسی میں روغن کے ساتھ دوبارہ ڈال دیں اس کے بعد چاول کو آدھا ابال گوشت پر تہہ لگا دیں اور تھوڑا پانی ڈال کر تمام چاول مل جانے کے بعد تھوڑا گھی ڈال کر اس کے ڈھکن کو آٹے سے بند کر دیں اور ڈھکن کے اوپر پانی ڈال دیں اور مناسب آنچ پر اسے رکھ دیں اور اس کے اوپری ڈھکن پر بھی کوئلہ رکھ دیں جب پانی خشک ہو جائے اور گھی کی آواز آنے لگے تو آنچ پر سے ہٹا لیں اور دو گھڑی کے لئے دم پر رکھ دیں اور اس کے بعد استعمال کریں۔ (ورق ۲۲۔الف)

اقسام پختن پلاو دم پخت مرغ

سامان: مرغے کا گوشت، روغن زرد، دارچینی، چاول، الائچی، لونگ، زعفران، جغرات، پیاز، ادرک، کشمش، کشنیز

پہلے گوشت کو قیمہ کر لیں اور روغن زرد میں پیاز کو بریان کرنے کے بعد بگھار دیں اور نمک کا پانی اور کشنیز کے ساتھ دو پیازہ کے ساتھ مصالحے ملا کر مرغ کے شکم کو ادرک اور کشمش سے بھر دیں اور مرغ کو دھاگے سے باندھ کر اس پر جغرات اور زعفران ملیں اور اسے گھی اور پانی میں بریان کریں تاکہ وہ نرم ہو جائے جب وہ گھی میں رہے تو اس پر توجہ دیں اور چاول کو دوسرے برتن میں لونگ اور دارچینی کی پوٹلی باندھ کر پولاو بنا لیں اور اس کے اوپر گھی ڈالیں جب پولاو بن جائے تو اس میں یہ مرغ اس کے تمام مصالحے اور گھی کے ساتھ ملا لیں اور استعمال کریں۔ (ورق ۲۴۔الف وب)

قلمی نسخے کے عناوین اور لذیذ پکوانوں کی فہرست اس طرح ہے:

اقسام نانہا

۱۔نان روغنی، ۲۔نان سنگ، ۳۔نان پنیر، ۴۔نان باقر خان، ۵۔نان شیر مال، ۶۔نان بادامی، ۷۔نان خطائی، ۸، نان جوار چپاتی، ۹۔نان ورقی، ۱۰۔نان بید ہوائی، ۱۱۔نان خرمی، ۱۲۔نان سادہ خمیر، ۱۳۔نان تا تان

قسم دوم طریق پختن آشہا

۱۔آش کمیلی، ۲۔آش مادری، ۳۔آش ترہ، ۴۔آش ترہ چاشنی دار تمغہ، ۵۔آش سرنگ، ۶۔آش نخودی، ۷۔آش چاشنی دار

قسم سوم طریق قلیہ ہا دو پیازہ ہا

۱۔قلیہ چاشنی دار،۲۔قلیہ ملغوبہ،۳۔دو پیازہ نخود آب،۴۔شوربای مرغ،۵۔قلیہ شکر قند،۶۔قلیہ برسکی،۷۔قلیہ نخودی،۸۔قلیہ پولاوی،۹۔قلیہ نبورہ انگور،۱۰۔قلیہ کندن،۱۱۔شیر لائی،۱۲۔قلیہ سنگ شیر،۱۳۔قلیہ ماہی،۱۴۔قلیہ آمیختہ،۱۵۔زعفرانی چاشنی دار،۱۶۔قلیہ نارنجی،۱۷۔قلیہ سموسہ،۱۸۔قلیہ بادامی،۱۹۔قلیہ روہوماہی،۲۰۔مغز استخوان،۲۱۔پختن کلّہ خاصہ (سری)،۲۲۔قلیہ دو پیازہ،۲۳۔دو پیازہ خربوزہ خام باکدو،۲۴۔دو پیازہ پالک،۲۵۔دو پیازہ شیرازی،۲۶۔دو پیازہ کوفتہ لعابدار،۲۷۔دو پیازہ کریلہ،۲۸۔دو پیازہ بادنجان،۲۹۔دوسرے قسم کا بادنجان کا قلیہ،۳۰۔دو پیازہ رتالو،۳۱۔دو پیازہ معلّٰی،۳۲۔دو پیازہ بادنجان جنوبی،۳۳۔دو پیازہ زمین قند،۳۴۔دو پیازہ خربزہ خام،۳۵۔پختن شکر قند،۳۶۔پختن ساگ چولائی،۳۷۔پختن کلی کچنار

قسم چہارم در طریق پختن بھرتہ ہا

۱۔بھرتہ کرآبی،۲۔دوسرے قسم کا بھرتہ،۳۔بھرتہ شیرازی،۴۔بھرتہ کوفتہ،۵۔بھرتہ گوشت

قسم پنجم در انواع زیر بریان ہا

۱۔زیر بریان فحلی،۲۔زیر بریان رومی،۳۔زیر بریان چتری،۴۔زیر بریان خراسانی،۵۔زیر بریان ماہی،۶۔زیر بریان ماہی با گوشت

قسم ششم اقسام پختن پلاو

۱۔پلاؤ دم پخت مرغ،۲۔نارنجی پلاؤ،۳۔پلاؤ قبولی،۴۔تمغہ پلاؤ،۵۔پلاؤ زعفرانی،۶۔قورمہ پلاؤ،۷۔قورمہ پلاؤ دوسرے انداز کا،۸۔پلاؤ سادہ،۹۔پلاؤ تہہ بالا،۱۰۔پلاؤ شاہجہانی،۱۱۔قبولی خاص،۱۲۔شیر پلاؤ،۱۳۔زرد پلاؤ،۱۴۔گرما پلاؤ،۱۵۔کشتلی پلاؤ،۱۶۔خیر پلاؤ،۱۷۔پار پلاؤ،۱۸۔کلپو پلاؤ،۱۹۔عدس پلاؤ،۲۰۔کوکو پلاؤ،۲۱۔قیمہ پلاؤ،۲۲۔تنجن پلاؤ،۲۳۔تنجن پلاؤ لعابدار،۲۴۔پلاؤ لعابدار مع بادام،۲۵۔قبولی تھولی،۲۶۔انبہ (آم) پلاؤ،۲۷۔بادنجان پلاؤ،۲۸۔تلاچی پلاؤ،۲۹۔فالسہ پلاؤ،۳۰۔نخود پلاؤ وبا کوفتہ

پلاؤ شاہجہانی

سامان: گوشت حلوان، گوشت مرغ، روغن زرد، مغز بادام، جغرات، دارچینی، لونگ، مرچ، الائچی، پیاز، ادرک، چاول، کالا زیرہ، کشنیز و نمک

سب سے پہلے گوشت کو پیاز، ادرک، نمک، گھی، کشنیز کو ہم وزن کر کے لعاب دار چینی بنالیں جب وہ آدھا پک جائے تو اس میں گوشت حلوان ڈال کر جوش دیں اور حلوان کے گوشت کو شوربے سے الگ کرلیں اور تھوڑے گھی میں دو کشنیز

کے ساتھ ہم وزن لعاب کی یخنی بنالیں جب وہ بھی آدھا پک جائے تو حلوان کا گوشت اس میں ڈال دیں اور جوش دے کر حلوان کے گوشت کو شوربے سے نکال لیں اور اسے اوپر نیچے کریں اور چلائیں اور کشنیز والے لعاب کو ڈال دیں اس کے بعد جغرات اور بادام کو کس کر تھوڑا سنہرا کر لیں جب لعاب تھوڑا گاڑھا ہو جائے اور گوشت نرم ہو جائے تو اسے مصالحوں میں ملا کر رکھ لیں اور شوربے کی یخنی کو اوپر سے بگھار لگالیں اور چاول کو پانی میں ابال کر شوربے میں ملا دیں اور یخنی کی پوٹلی کو دوسری دیگچی میں پوٹلی، مصالحے اور مرچ کو صحیح طریقہ سے کوٹ کر زیرہ کو تہہ بتہہ بچھا کر اس چاول کی تہہ بچھا کر پاؤ گھڑی تک آگ پر رکھ کر دم دیں اور اوپر سے بچا ہوا روغن ملا دیں اور دیگ سے نا کل لیں اور حلوان کی یخنی کو بھی لعاب سے سجالیں اور استعمال کریں (ورق ۲۴۔الف وب)

قلمی نسخے کی خصوصیات

ہر قلمی نسخہ جداگانہ خصوصیات کا متحمل ہوتا ہے موجودہ قلمی نسخہ بھی کئی طرح کی خصوصیات سے مملو ہے جس میں سے چند اہم خصوصیات ہیں:

۱۔اس قلمی نسخے میں ہر ورق کے نیچے catch word یا رکابہ موجود ہے جس سے پڑھنے والے کی مدد ہوتی ہے اور وہ ہر ورق پر یہ چیک کر سکتا ہے کہ پچھلے ورق کے آخری لفظ کے بعد اگلے ورق پر وہی لفظ ہے کہ نہیں جو catch word میں دیا گیا ہے۔

۲۔قلمی نسخے میں ہیڈنگ کو سرخ روشنائی میں لکھا گیا ہے اور قدرے جلی ہے تا کہ پڑھنے والے کو دقت پیش نہ آئے۔

۳۔قلمی نسخہ یوں تو نستعلیق خط میں ہے مگر کچھ جگہوں پر کاتب نے اس میں خط شکستہ کی آمیزش سے اس کی عبارتوں کو بوجھل کر دیا ہے۔

۴۔قلمی نسخے کی زبان بہت معمولی ہے اور مولف کو جہاں فارسی الفاظ نہیں ملے اس نے اردو الفاظ سے کام چلایا ہے مثال کے طور پر ہر جگہ لفظ ''بگھار'' فارسی میں اسی طرح لکھا ہے۔

۵۔قلمی نسخہ ناقص ہے کیونکہ آغاز میں مشمولات کو قسم دہم تک شمار کیا گیا ہے جو انواع مربہ ہا وغیرہ ہے لیکن اصل نسخہ قسم ششم یعنی انواع پلاؤ پر ختم ہو جاتا ہے گویا اس میں چار انواع کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

۶۔قلمی نسخے میں کوئی ترقیمہ (Colophan) نہیں ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت کا بھی ذکر نہیں ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ دس قسم کے پکوانوں کو ذہن میں رکھ کر تالیف کیا گیا تھا مگر مولف فقط ۶ پکوانوں کی تفصیل ہی لکھا پایا اور کسی بھی وجہ سے وہ اس کی تکمیل نہ کر سکا۔

۷۔اس قلمی نسخے کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ عام طور سے قلمی نسخوں میں ترقیمے وغیرہ ملتے ہیں مگر اس نسخے میں پلاؤ

کے ضمن میں تیسواں پلاؤ ''نخود پلاؤ با کوفتہ'' عنوان کے بعد قلمی نسخہ ختم ہو جاتا ہے مگر اس کی تکمیل کے بعد جو کاتب نے ''تمت تمام شد'' کتاب کے خاتمے پر درج کیا ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نسخہ تکمیل ہو گیا ہے اور مزید کچھ تحریر کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

۸۔ قلمی نسخے کی دونوں مہریں ناخوانا ہیں اور اس کو پڑھا نہیں جا سکا اگر یہ مہریں واضح ہوتیں تو شاید اس نسخے کے بارے میں مزید اطلاعات مل پاتیں۔

☆☆☆

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی
صدر شعبہ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

گلستان سعدی کی مقبولیت کا راز

چکیدہ : سعدی شیرازی کی شخصیت کم از کم فارسی زبان و ادب یا اخلاقیات کے طالب علم کے لئے کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں، سعدی بے مثل شاعر بھی ہیں اور بہترین نثر نگار بھی۔ دونوں میدانوں میں انہوں نے اخلاقیات کو عام کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، گلستان و بوستان دونوں تصانیف اخلاقی مضامین کا مجموعہ ہیں۔ گلستان کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ اس کے تقریباً تمام زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں مقبولیت کی خاص وجہ اخلاقی مضامین کو بڑے ہی دلکش، آسان، عام فہم انداز میں قارئین کے لئے پیش کرنا ہے۔

کلیدی الفاظ: سعدی شیرازی، گلستان، بوستان، اخلاق، ضرب المثل، حکایت

دنیا ایک سرائے فانی ہے جو مختلف لوگوں کی آماجگاہ ہے نہ تو ان کا یہاں کوئی پرسان حال ہوتا ہے اور نہ وہ خود اپنی شناخت کرا پاتے ہیں اور نہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دیتے ہیں جس کو یاد رکھا جائے لیکن اس کے برعکس اگر دیکھا جائے تو کچھ ہستیاں ایسی بھی گزری ہیں جن کو صدیاں گزرنے کے بعد بھی لوگ یاد رکھے ہوئے ہیں اور ان کو فراموش کرنا بھی ناگزیر عمل ہے۔ سعدی شیرازی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی انمٹ چھاپ چھوڑ رکھی ہے اور یہ چھاپ ان کے کارناموں کی ہے جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔

شیخ سعدی کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں بلکہ یوں کہا جائے تو کچھ غلط نہیں ہوگا کہ ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہوگا۔ فارسی ادب ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ادب میں ان کو اور ان کی تحریروں کو ایک بلند، اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔ گلستان سعدی کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے اور اس قدر اہمیت اور وقار شاید ہی کوئی تصنیف ایسی ہو جس کو ملا ہو۔ دانائے مشرق شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے اور عصر حاضر میں بھی اس کی مقبولیت شہرت و عظمت میں کوئی کمی نہیں دیکھی گئی۔

سعدی شیرازی کی حکایت نگاری میں زمانہ کی عکاسی بہت زیادہ پائی جاتی ہے سعدی کی زندگی کا بیشتر وقت سیر و

سیاحت میں گزرا۔ زمانہ کے سرد وگرم، عروج وزوال کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کا سامنا کیا۔ ان کے پاس تجربات کا وہ خزانہ تھا کہ زندگی کے ہر گوشہ پر انہوں نے قلم آزمائی کی ہے اور اپنے زریں وروشن خیالات وتجربات سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ سعدی کو صحیح معنوں میں جامع کمالات ہیں۔ صداقت بیانی، جذبات کی عکاسی اور سادہ بیانی میں ان کا ثانی مشکل سے ملتا ہے۔ معلم اخلاق کے اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی تحریریں پر اثر، پر مغز، تصنع سے پاک و پاکیزہ، انسان دوستی سے بھرپور ہیں اور اس بات سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

دنیا میں گوناگوں عادت واطوار کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے اخلاق وکردار بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں لیکن تعلیم ایک ایسا زیور ہے جس سے انسان کے کردار کو سنوارا سجایا جاسکتا ہے اور اعلیٰ اخلاق کے ذریعہ شخصیت میں نکھار لایا جاسکتا ہے اسی امر محال کو سعدی نے اپنی اخلاقی تعلیم سے کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ان کا یہ یقین تھا کہ بدخصلت اور فتنہ پرور انسان بھی سلیم الطبع اور راہ راست پر چلنے والا بن سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور اس کی رضا وسخاوت کو حاصل کر سکتا ہے اسی کو انہوں نے اپنی اس ضرب المثل سے پیش کیا ہے:

''راستی موجب رضائے خدا است کس نہ دیدم کہ گم شد از راہ راست۔'' (سچائی خدا کی رضا کے لئے ہے اور کسی بھی شخص کو نہیں دیکھا کہ راہ راست پر چل کر گم ہو جائے)

گلستاں کی بنیاد اخلاق پر ہے اور سعدی نے اس کو آٹھ ابواب پر منقسم کیا ہے جس میں ہر باب اپنی ایک الگ اہمیت وحیثیت کا حامل ہے۔ سیرت پادشاہان، در اخلاق درویشاں، در فضیلت قناعت، در فوائد خاموش، در عشق جوانی، در ضعف پیری، در تاثیر تربیت اور در آداب صحبت وحکمت۔ سعدی وسیع سے وسیع مضامین کو مختصر سے مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ معنی کی ایک دنیا ان میں سما جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معنی الفاظ کے تابع ہوں ان کی یہ خوبی دریا کو کوزے میں سما لینے کے مانند ہے۔ ایجاز واختصار میں گلستاں کے مدمقابل کوئی دنیاوی کتاب نہیں مثلاً کوئی بادشاہ فقیر کی آواز کو سن کر کہتا ہے۔ ''درویش دامن بیار'' فقیر جواب دیتا ہے ''دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم''۔ (درویش اپنا دامن لاؤ اس پر فقیر جواب میں کہتا ہے کہ جب جامہ ہی نہیں ہے تو دامن کہاں سے لاؤں)

اسی طرح اگر فتنہ انگیزی کو ختم کرنا ہو تو مصلحتاً انسان کو خاموش رہنا چاہئے یا ایسی جگہ اگر اس کو غلط بیانی سے کام لینا پڑے اور اس میں کسی کا نقصان نہ ہو تو اس کے لئے اس طرح بیان کرتے ہیں، ''دروغ مصلحت آمیز بہ ز راستی فتنہ انگیز۔'' (ایسا جھوٹ جو فتنہ کو ختم کرے سچائی بیان کرنے سے بہتر ہے)

سعدی بہت قناعت پسند انسان تھے اور اس کی فضیلت کا بھی اندازہ بخوبی تھا اور جگہ جگہ قناعت کا درس بھی دیا ہے اور ان کی تحریروں کا لب لباب بھی یہی موضوع رہے ہیں کوئی شخص اپنی کم مائیگی کا شکوہ اللہ تعالیٰ سے کر رہا تھا کہ اے خدا

میرے پاس پاپوش نہیں ہے اور میری حیثیت بھی ان کو خریدنے کی نہیں ہے تھوڑی دیر بعد وہی شخص ایک ایسے شخص کو دیکھتا ہے کہ جس کے پاؤں نہیں تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کر رہا تھا اس انسان نے فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور شکر کیا کہ میرے پاؤں ہیں تو میں شکوہ کر رہا ہوں اور وہ نیک بندہ بغیر پاؤں کے تیرا شکر ادا کر رہا ہے۔

سعدی کی ضرب المثل بہت زیادہ مقبول اور رائج ہیں اور ہر مکتب فکر کے لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں جیسے مال غنیمت کا بے دردی سے استعمال ہوتا دیکھ کر اس طرح گویا ہوتے تھے، ''خود کردہ را علاج نیست''۔ چونکہ آپ ناصحانہ طبیعت کے حامل تھے اس لئے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی نصیحت کیا کرتے تھے مثلاً ایک پارسا کے لڑکے کو اپنے چچا کے مرنے پر بہت سا مال و دولت ترکے میں ملا اس نے دونوں ہاتھوں سے یہ مال و دولت عیاشی و بدکاری میں خرچ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کو اس بات سے روکنے کی کوشش کی اور کہا اچھا طرز عمل اختیار کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دولت ختم ہو جائے اور تجھے تکلیف ہو اس نوجوان نے اس نصیحت پر عمل نہیں کیا اور کچھ وقت بعد اس کو فاقہ کشی کرنا پڑی کیونکہ اس نے چچا کی دولت کو بیجا طور پر استعمال کیا۔ ایسے موقع پر یہ مثال بھی کثرت سے دی جاتی ہے، ''مال مفت دل بے رحم''، ''خود کردہ را علاج نیست''۔ اسی لئے سعدی کا یہ قول بھی پوری صداقت کا ضامن ہے، ''تین چیزوں کو بقا نہیں ہے مال تجارت کے بغیر، علم بحث کے بغیر اور ملک تدبیر کے بغیر''۔ اس طرح کی بہت ساری ضرب المثل بہت مشہور و مقبول ہیں: خطائے بزرگان گرفتن خطاست، ہر جا کہ گل است خار است، مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید، ہر عیب کہ سلطان نہ پسندد ہنر است، دشمن را نتواں حقیر و بیچارہ شمرد، من آنم کہ من دانم، حساب پاک است از محاسبہ چہ پاک۔ یہ چند ضرب المثل بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ایسی ہزار ہا ضرب المثال سعدی کی گلستاں میں موجود ہیں۔

فارسی اور اردو کی تحریروں و تقریروں میں جس قدر گلستان کے جملے، اشعار اور مصرعے ضرب المثال ہیں اور کسی زبان میں نہیں ملتے۔ عصر حاضر میں اخلاقی اقدار کا تنزل اس قدر تیزی سے ہو رہا ہے کہ عقل حیرت زدہ رہ جاتی ہے، معاشرہ میں تہذیب و تمدن، رواداری اور وضع دار کا خاتمہ ہوتا جا رہا ہے، خود پسند انسان اپنی خواہشات، آسودگی، آسائش اور عیش پرستی کا غلام بن گیا ہے نیز اپنے اکناف و اطراف سے بے خبر ہے ایسے پر آشوب ماحول میں ضرورت ہے گلستان سعدی کی جس کی عظمت، اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ مشعل راہ کا کام کرتی ہے۔ یہ تصنیف سادہ بیانی، فصاحت و بلاغت کا بحر بیکراں و پند و نصائح کا بیش بہا خزانہ ہے جو نہ تو گذشتہ زمانوں میں لکھی گئی اور نہ آئندہ زمانہ میں ایسی نایاب تصنیف لکھنے کی امید ہے اس کو وہ معتبر مقام حاصل ہے کہ اس کی عظمت و وقار کو دیکھ کر انسان سر دھننے لگتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید
صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حدیث ہندوستان ونطق دودلدادگان

چکیدہ:۔ ہندوستان کی صوری و معنوی خصوصیات کی داستان کے جواہرات سے ہند فارسی ادب کا دامن بھرا ہوا ہے۔ فارسی شعراء و ادباء نے اس کشور ستان کے تجملات کے بیان ہی بہترین نگارستان سے فارسی ادب کو غنی کیا ہے۔ پیش نظر مقالے میں امیر خسرو اور ابو طالب کے اشعار میں عروس زیبائے ہند کی جو رعنائیاں مذکور ہوئی ہیں ان کا ایک مرقع پیش کیا گیا ہے۔ خسرو دہلوی کی مثنویات قران السعدین، دول رانی خضر خاں اور نہ سپہر میں ہندوستان کے موسم، پھولوں، افراد اور اشیاء کا جو عکس دلکش اشعار کا پیرہن اوڑھے جلوہ افگن ہے اس پر گفتگو کے بعد ابو طالب کلیم کی مثنویات و قصائد میں اس کشور عظمت نشان کی جو خوبیاں مذکور ہوئی ہیں اور جو نقوش مرقسم ہوئے ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ:۔ امیر خسرو، کلیم کاشانی، قران السعدین، دول رانی خضر خاں، نہ سپہر، شاہجہاں، گروہ محترفہ، بزار، تنبولی، دوبی

ہندوستان کی سرشت وطینت میں کشادگی وفیاضی طبع اور وسعت قلب ونظر کا مادہ وفور کے ساتھ ودیعت ہوا ہے، جبھی تو یہ سرزمین ربع مسکون کے تمام بلاد وامصار کی جلب توجہ کا باعث رہی ہے۔ وہ ماقبل مسیح کا دور ہو یا مابعد میلاد مسیح کا، ہر زمانے میں اطراف واکناف عالم سے جوق در جوق انسانی کارواں اس سرزمین کا رخ کرتے رہے، اسے اپنا مستقر و مسکن بناتے رہے اور اس کی خاک سے اپنا مرام ومراد حاصل کرتے رہے۔ مختلف تہذیب وفرہنگ کے ان علمبرداروں کی آمد اور یہاں کی تہذیب سے ان کے اختلاط کے نتیجے میں ہندوستان میں جو قدر مشترک اور گنگا جمنی تہذیب وجود میں آئی وہی آج بھی سارے جہان میں ہمارے لئے باعث افتخار اور سرمایۂ گرانقدر ہے اور ہماری انفرادیت، یگانگیت اور ہمدلی کی معتبر ومستند دلیل ہے۔ عرب وایران اور ترک وروم وغیرہ ممالک کے ان واردین نے سرزمین ہندوستان کی ان ہی خصوصیات کے متعلق اپنے جذبات دلی اور افکار صمیمی کا بجا طور پر اپنی ترقیمات میں خوبصورت اظہار کیا ہے۔

فارسی کے منثور ومنظوم ادب میں بھی ہندوستان کے شکوہ جلالت اور فضل وافضال کی داستان سے صفحے بھرے

ہوئے ہیں۔ راقم نے اس مقالے میں ہندوستان کے دو مشاہیر فارسی شعراء خسرو دہلوی اور کلیم کاشانی کے منظوم کلام میں ہندوستان کے وصف واوصاف میں پائے جانے والے دلنشیں بیان کا کسی قدر احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔

امیر خسرو کے تقریباً تمام منظوم ومنثور کلام میں بیشتر مقامات پر ہندوستان سے ان کی شیفتگی، وطن دوستی اور حب الوطنی کا عاطفہ ضرور عیاں نظر آتا ہے لیکن ان کی تین مثنویوں قران السعدین، عشقیہ یا دولرانی خضر خاں اور نہ سپہر میں خصوصیت کے ساتھ اس کا اہتمام نظر آتا ہے۔ قران السعدین تاریخی حیثیت کی مثنوی ہے جو امیر خسرو نے کیقباد اور بغرا خان کے درمیان دریائے سرجو کے کنارے ہونے والی ملاقات کے موضوع پر لکھی ہے، لیکن اس مثنوی میں انہوں نے ہندوستان کے معاشرتی حالات بھی مذکور کئے ہیں۔ دہلی کی عمارتیں، آلات موسیقی، رقص وسرور کی بزمیں، ہندوستان میں پائی جانے والی کشتیوں اور ان کے اقسام اومیووں وکھانوں کی تعریف وتوصیف کا ذکر وغیرہ جیسے موضوعات پر بھی اشعار پر اشعار کہے ہیں۔ اس مثنوی میں پان کے وصف میں جو اشعار ہیں ان میں خسرو سخن نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہندوستان کی اس خاص چیز کا ذکر کیا ہے۔ پان کی گلوری اہل ہند کے لئے بڑی قیمتی اور بہترین نعمت ہے۔ اس کے رگ وریشے میں خون کا وجود بھی نہیں لیکن پان کی رگوں سے خون کا جریان ہوتا ہے، پان کھانے سے منہ کی بو دفع ہوتی ہے، دانت مضبوط ہوتے ہیں، بھوک بڑھتی ہے، بھوکے شخص کی بھوک کم ہوتی ہے۔ پان کے استعمال سے پیدا ہونے والی سرخی اس کے خدمتگاروں یعنی چونہ وسپاری کی خدمت سے میسر ہوتی ہے۔ پان جتنا پرانا ہوتا ہے اس میں آب وتاب زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایسا پتہ ہے جو شاخ سے جدا ہونے کے چھ ماہ بعد تک تروتازہ رہتا ہے اور ایسا مطبوع ومقبول ہے کہ شاہ وگدا یکساں اس کی تکریم وتعظیم کرتے ہیں۔ خود خسرو کی زبان سے پان کی فضیلتیں سماعت فرمایئے:

☆ بیرۂ تنبول کہ صد برگ بست — چون گل صد برگ بیامد بہ دست
نادرہ برگی چو گل بوستان — خوب ترین نعمت ہندوستان
پر رگ و در رگ نہ نشانی ز خون — لیک ہم از رگ دودش خون برون
طرفہ نباتی کہ چو شد در دہن — خونش چو حیوان بدر آید ز تن
خوردن آن بوی دہن کم کند — سستی دندان ہمہ محکم کند
سیر خورد گرسنہ در دم شود — گرسنہ را گرسنگی کم شود
سرخی رویش ز سہ خدمت گرش — چونۂ و فوفل شدہ رنگ آورش
☆ گر چہ کہ آبش بنوی ہست بیش — کہنہ شود بیش کند آب خویش
گر چہ کہ از آب شود زرد رو — لیک ز زرد بیش بود آبرو

☆ برگ عجب بین کہ گسستہ زبر وز پس شش ماہ بود تازہ تر
حرمتش از پیشگہ و پایگاہ ہم بگدا محترم و ہم بشاہ

(قران السعدین،ص۸۶۔۱۸۵،بکوشش سید حسن برنی)

پان کی تعریف وتوصیف میں امیر خسرو نے اپنی شاہکار منثور تصنیف اعجاز خسروی میں بھی اپنے قلم کی جولانی دکھائی ہے چنانچہ اعجاز کی دوسری جلد کے خط نہم میں پان کے بیالیس محاسن اور پینتالیس معائب گنائے ہیں۔(عہد خلجیان کی نمائندہ فارسی منثورات،راقم،ص۱۸۶)

قران السعدین میں امیر خسرو نے شہر دہلی کے اوصاف بھی دل کھول کر بیان کئے ہیں، دہلی ان کی نگاہ میں جنت عدن ہے اور ایسا گلستان مکرمت ہے کہ اگر اس کی مکہ مکرمہ سن لے تو احرام باندھ کر اس کے طواف کو خود یہاں آجائے چنانچہ خود خسرو کے اشعار ہیں:

☆ حضرت دہلی کنف دین و داد جنت عدنست کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات حرّسہا اللہ عن الحادثات
☆ گر شنود قصۂ این بوستان مکہ شود طائف ہندوستان
شہر نبی را بسر او قسم شہر خدا گشتہ ز صیتش اصم

(قران السعدین،ص۲۹۔۲۸،ھمان)

باشندگان دہلی بھی امیر خسرو کی نگاہ میں بڑے محترم ومحتشم ہیں، وہ فرشتہ صفات ہیں اور اہل بہشت کی مانند خوش اخلاق وخوش اطوار ہیں، ساری دنیا کے باشندوں میں انفرادی طور پر جو صفات ہیں وہ سب کی سب بلکہ ان سے افزوں باشندگان دہلی کی ذات میں مجتمع ہے، یہاں کے بیشتر لوگ اہل علم وفضل ہیں، خسرو کہتے ہیں:

☆ مردم او جملہ فرشتہ سرشت خوش دل و خوش خوی چو اہل بہشت
☆ ہر چہ ز صنعت بہ ہمہ عالم ست ہست در ایشان و زیادت ہم ست
☆ بیشتر از علم و ادب بہرہ مند اہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

(قران السعدین،ص۳۴)

خسرو نے قران میں جن بہت سی چیزوں کا وصف بیان کیا ہے ان میں خربوزہ بھی ہے، وہ ہندوستان کے خربوزے کو جنت کے پھلوں سے بہتر تصور کرتے ہیں، اس کی ظاہری شکل وصورت اور باطنی اوصاف کا بیان منفرد انداز میں کرتے ہیں، خسرو خربوزے کو ایسا دلنشیں معشوق تصور کرتے ہیں جو سبز خط والا ہے لیکن اس کے خط بالوں سے خالی ہیں،

اس کے اندر مشک جیسی خوشبو ہے لیکن مشک اس جیسی خوشبو سے عاری ہے، اس کی کمان نے پانی میں گھات لگا رکھی ہے، اس کی کمان کی لذت وتابانی باعث دید ہوتی ہے، اس کی زہ کا رنگ سبز ہے اور کمان آبگون ہے، ہر پھل کے سر پر کلاہ ہوتی ہے لیکن خربوزہ سراپا سر ہے، مزہ ولذت میں یہ بہت شیرین وشکرین ہوتا ہے چنانچہ خود خسرو کے الفاظ ہیں:

☆ خربوزہ گوئی کہ بصحرا و کشت — گوئی ربود از ثمرات بہشت
☆ سبز خطی در خط او موی نہ — مشک دمی مشک بدان بوی نہ
ساختہ در آب کمانش کبین — چاشنی و آب کمانش ببین
رنگ زہش سبز و کمان آبگون — زہ ز برون بستہ کمان از درون
بر سر ہر میوہ کلہ در شدہ — بہر کلہ را ہمہ تن سر شدہ
از مزہ گرد آمدہ دروی نبات — خام خضر پختہ چون آب حیات

(قران السعدین، ص۱۰۹)

اسی طرح اپنی مثنوی ''دولرانی خضر خاں'' میں امیر خسرو نے ہندوستان اور یہاں کی چیزوں کے اوصاف کے بیان میں انتہائی والہانہ پن اور شیفتگی کا اظہار کیا ہے۔ اس مثنوی میں انہوں نے اپنے عہد کے ہندوستان اور ہندوستانی رسم و رواج، تہذیب واقدار اور روایات کا دلکش انداز میں ذکر کیا ہے۔ ہندوی زبان اور اس کے اوصاف وخصائص بڑے شد ومد سے بیان کئے ہیں اور اسے فارسی زبان سے کمتر نہیں جانا ہے۔ سوائے عربی زبان کے کہ جسے وہ ہندوی سے متفوق اور برتر سمجھتے ہیں، رے وروم کی ساری زبانوں میں انہیں ہندوی محتشم ومرتفع نظر آتی ہے۔ ہندوی زبان خود اپنے سرمایہ سے مرفہ و معمور ہے، اس لئے متاع عاریت سے بے نیاز ہے۔ خسرو کہتے ہیں:

☆ غلط کردم گر از دانش زنی دم — نہ لفظ ہندیست از پارسی کم
بجز نازی کہ میر ہر زبان ست — کہ بر جملہ زبانہا کامران ست
دگر غالب زبانہا در ری و روم — کم از ہندیست شد ز اندیشہ معلوم
☆ زبان ہند ہم تازی مثال است — کہ آمیزش در آنجا کم مثال است
گر آئین عرب نخواست و گر صرف — ازان آئین درین کم نیست یکحرف

(دولرانی خضر خاں، ص۴۲۔۴۱، بتصحیح رشید احمد سالم)

ہندوستان کے کپڑے، پھل، پھول اور مہوشان بلا خیز امیر خسرو کو سارے عالم سے ممتاز ومنفرد نظر آتے ہیں۔ ایک طرف اگر وہ دیوگیر میں بننے والے نفیس وباریک کپڑے دیوگیری کے اوصاف بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف آم کو

دنیا کے تمام پھلوں میں ممتاز قرار دیتے ہیں۔ ہندوستان ان کی نگاہ میں جنت نشان ہے اور توجیہ اس کی یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر یہ زمین جنت نہ ہوتی تو حضرت آدم اور موروسانپ یہاں کیوں بھیجے جاتے۔ کہتے ہیں:

بہشتی فرض کن ہندوستان را کز آنجا نسبت ست این بوستان را
وگر نہ آدم و طاؤس ز انجای کجا اینجا شدندی منزل آرای

(دولرانی خضرخاں، ص۴۴)

اپنی مثنوی نہ سپہر کے تیسرے سپہر میں بھی امیر خسرو نے ہندوستان کے جنت نشان ہونے کے دعویٰ میں سارے دلائل پیش کئے ہیں اور نہایت منطقی انداز میں اسے ثابت کیا ہے۔ ہندوستان کے جنت نشان ہونے کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے یہیں اتارے گئے، دوسرے جنت کا پرندہ مور بھی یہیں اتارا گیا، تیسرے سانپ کو بھی یہیں اتارا گیا، چوتھے جب حضرت آدمؑ حضرت حواؑ کی تلاش میں حدود ہند سے باہر نکلے تو ویسے ہی مضطرب وبیقرار رہے جیسے جنت سے نکالے جانے پر، پانچویں اس سرزمین میں خوش دلی وعیش وکامرانی کی فراوانی ہے، چھٹے رسول اکرم ﷺ کے فرمان عالی کے مطابق دنیا غیر مؤمنوں اور غیر کلمہ لوگوں کے لئے جنت ہے اور ورود آدم سے لیکر ورود اسلام تک یہاں بے دینوں کی کثرت رہی ہے اور آخری یہ کہ یہاں اب مبارک شاہ خلجی کی حکمرانی ہے جس کے دور اقتدار میں ہندوستان جنت نشان اور فردوس صفت ہے۔ چنانچہ خسرو کی زبان میں:

☆ کشور ہند است بہشتی بہ زمین حجتش اینک برخ صفحہ بہ بین
☆ آمدن از خلد بہندش بد ازان کان گل جنت کہ زدش باد خزان
گر بخراسان و عرب یا ری و چین یک نفسی بہرہ گرفتی بہ زمین
گرمی و سردی خراسان و عرب وآن بہ وی وچین عذابیست عجب
او شدہ پروردہ بفردوس درون چونش بدی طاقت این اندوہ چون
گشت محقق بچنین وصف متین کین ہمہ ہند است چوفردوس مہین
☆ حجتی دیگر کہ ز طاووس کشم مرغ خرد را بزمین بوس کشم
گر نہ بہشت است ہمین ہند، چرا از پی طاووس جنان گشت سرا؟
☆ حجتم اینست سیوم گربہ شکی کامدن مار ز باغ فلکی
بود بہمراہی طاووس و صفیؑ قصہ چنین گفت فقیہ حنفی
☆ حجت چارم مگر اینست کہ چون زد قدم ز حد ہند برون

بود دلش از پئ حوا بہوا درد جدائیش نمی بافت دوا
☆ حجت پنجم شنو کین کز ہمہ کس نزد ہمہ خلق رسیدہ است نفس
☆ خوشدلی و عیش فزایست چنان کان زمی از روح شدہ دار جنان
☆ ہست ششم حجتم کین ہست خبر ز احمد مرسل کہ بہ تحقیق نگر
نعمت دنیا کہ بمانیست سزا از پئ گبران است بہشتی بہ جزا
زین سخن از آدم تا نوبت دین ہند بدی بر کفرہ خلد برین
☆ حجت ہفتم شنو این محکم و پر پیش تو آراستہ چون رشتہ بہ در
☆ قطب زمان کز کرمش یافت نما سبزۂ مینو نہ مینای سما
☆ شاہ مبارک کہ جہان از رخ او گشت بہشتی چو رخ فرخ او

(نہ سپہر، ص ۱۵۷۔۱۵۱، بٹیسٹ مشن پریس کلکتہ، ۱۹۴۸ء)

ہندوستان کے پھولوں کو بھی امیر خسرو خراسان اور دیگر ممالک کے پھولوں پر ترجیح دیتے ہوئے گل کوزہ، صد برگ، جوہنی، گل کیوڑہ، رائے چمپا، گل دونہ، قرنفل، مولسری اور سیوتی وغیرہ کے اوصاف بتاتے ہیں۔ سیوتی زنبور کا معشوق ہے اور زنبور عسل اس پھول پر یوں عاشق ہے کہ موت کے بعد بھی اس کا عشق اسے سیوتی سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ خسرو گل دونہ کو ہندوستان کا ریحان سمجھتے ہیں اور شاہ سپرغم کو اس کا غلام جانتے ہیں۔ مولسری کا پھول، نافۂ مشک پر تفوق رکھتا ہے جبکہ رائے چمپا پھولوں کا بادشاہ اور سمنبروں و نازنینوں کا معشوق و محبوب ہے۔ امیر خسرو ہندوستان کے پھولوں کی دوسرے ممالک کے پھولوں پر فوقیت و برتری کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ گل لالہ وارغواں میں رنگ تو ہوتے ہیں، خوشبو نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ ہندوستانی پھولوں کے نام ہندی ہیں اور لالہ وارغواں کے ناموں کی طرح خوبصورت اور دلکش نہیں ہیں ورنہ یہاں کا ہر ہر پھول جنت کا باغ ہوتا۔ اگر یہ ہندوستانی پھول رے، روم یا شام کی سرزمین پر اگتے اور ان کے نام عربی یا فارسی ہوتے تو پھر دیکھتے کہ وہاں کے پرندے ان پھولوں کے عشق میں کیسے زمزمہ آرائی کرتے ہیں۔ خسرو کہتے ہیں:

چہ بینی ارغوان و لالہ خندان کہ رنگی ہست و بوی نیست چندان
گل مارا بہندی نام زشت ست وگر نہ ہر گلی باغ بہشت ست
گر این گل خاستی در روم یا شام کہ بودی پارسی یا تازیش نام
شدی معلوم تا مرغان آن بوم چسان غلغل زدندی در ری و روم

کدامی گل چنین باشد کہ سالی دہد بو دور ماندہ از نہالی

(دولرانی خضر خاں، ص۳۳۔۱۳۲)

خسرو باشندگان ہندوستان کے دوسرے ملکوں کے صاحبان علم وفضل پر تفوق کے بھی مدعی ہیں اور مثنوی نہ سپہر میں اہل ہند کی دانش وزیری میں اشعار پر اشعار کہے ہیں، اگر چہ حکمت روم سے ظاہر ہوئی لیکن ہندوستان بھی اس دولت سے خالی نہیں۔ منطق، نجوم، ریاضی، ہیئت اور دیگر علوم وفنون میں یہاں کے صاحبان علم وفضل برہمن ساری دنیا کے علماء پر فوقیت رکھتے ہیں۔ خسرو نے اس دعوے کی دس دلیلیں پیش کر کے اپنی بات ثابت کی ہے:

تا نبود در سخن بندہ شکی حجت این گفتہ دہ آدم نہ یکی

(نہ سپہر: ص۱۶۶، تصحیح محمد وحید مرزا، کلکتہ)

اہل ہند ہر زبان بولنے پر قدرت رکھتے ہیں، یہاں علم وفن کی بہتات ہے اور ایسے علوم بھی پائے جاتے ہیں جو دوسری جگہوں پر میسر نہیں، ساری دنیا سے طالبین علم یہاں آ کر اپنی تشنگی علم بجھاتے ہیں لیکن یہاں کے برہمن ایسے مستغنی ہیں کہ انہیں اکتساب فضل وعلم کے لئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان تو خود علم وفضل کا بحر ناپیدا کنار ہے۔ صفر اسی زمین کی دین ہے جس نے اپنی بے رنگ شکل کے باوجود اعداد ریاضی کو زینت ورنگ اور قدر وقیمت بخشی ہے، کلیلہ ودمنہ اور شطرنج اسی ہندوستان کی پیداوار ہیں، یہاں کا علم موسیقی سوز انگیزی ووجد آفرینی میں بہت بڑھ چڑھ کر ہے، یہاں کے جانور بھی نغمہ آشنائی کی بناء پر کیف ووجد کی کیفیت سے بہرہ مند ہیں چنانچہ یہاں ہرنوں کا شکار کرنے کے لئے صیاد نغموں کا سہارا لیتے ہیں اور خسرو جیسا مملکت شاعری وسخن سنجی کا بادشاہ ہندوستان کے علاوہ کہیں اور نہیں ہے:

حجت دہ آنکہ چو خسرو بسخن سحر گرمی نیست تہ چرخ کہن

(نہ سپہر، ص۱۷۲)

اپنی مثنوی نہ سپہر میں امیر خسرو ہندوستان کی محلی زبانوں کی بھی توصیف وتعریف کرتے ہوئے سندھی، لاہوری، کشمیری، دھور سمندری، تلنگی، گجراتی، معبری، بنگالی اور اودھی وغیرہ کے فضائل ومناقب تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور آخر میں رسم ستی کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ہندو عورتوں کے اپنی مرضی سے شوہروں کی چتاؤں پر جل کر قربان ہو جانے کو بے مثال جذبۂ وفا، بلند حوصلگی اور عشق کی معراج قرار دیتے ہیں، فارسی تہذیب وفرہنگ کے ہندوستان میں ورود کی ابتدائی صدیوں میں، ہندوستان کے فضائل ومناقب کی یہ داستان خود ہندوستان کے مایۂ ناز فرزند امیر خسرو کی زبان سے تھی لیکن:

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران گفتہ آید در حدیث دیگران

(مولانا روم)

کے مصداق آیئے ذرا خسرو دہلوی کے تقریباً تین سو سال بعد کلیم کاشانی کے کلام کے آئینے میں ہندوستان کے رخ زیبا اور جمال باکمال کا مشاہدہ بھی کرلیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ خسرو و کلیم کے درمیان کی مدت کا فارسی ادب ہندوستان کے مدائح سے خالی ہے بلکہ اس مدت میں عصامی، محمود گاواں، جمالی کنبوہ، غزالی مشہدی، عرفی شیرازی، نظیری، طالب آملی اور قدسی مشہدی وغیرہ بے شمار شعراء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ہندوستان کی مدح سرائی کی ہے لیکن کلیم کے یہاں ہندوستان اور باشندگان ہندوستان کی مدح وستائش کا رنگ اسے خسرو کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ کلیم ہمدان میں پیدا ہوا، کاشان میں ابتدائی ایام بسر کئے، شیراز میں اکتساب علم کیا، پھر فرمانروائے بیجاپور ابراہیم عادل شاہ کے یہاں پہنچا اور چودہ سال وہاں گذارے پھر ایران لوٹ گیا، دو سال بعد دوبارہ دہلی آیا اور شاہجہاں کے دربار سے وابستہ ہوکر ملک الشعراء کے منصب پر فائز ہوا۔

کلیم بھی ہندوستان کا شیفتہ و دلدادہ ہے اور اس معشوق نگاریں کے حسن پر کلیم کی فریفتگی کے مظہر اس کے وہ اشعار ہیں جن میں اس نے ہندوستان کے موسم، باشندگان، محترفان، مناظر فطرت، باغ وگلستان اور گل وسبزہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ کلیم نے شاہجہاں کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں ہندوستان کے موسم برسات کے وصف میں جو موتی اس نے پروئے ہیں اس سے کلیم کی برسات کے موسم سے شیفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ موسم برسات میں چمن وسبزہ زار بادلوں سے آراستہ ہورہے ہیں اور بادلوں کا یہ چھانا کلیم کو اپنا خانماں لٹا دینے پر اکساتا ہے اور عنادل کو متکیف کر دیتا ہے، شاخیں پھولوں سے اس طرح لدی ہوئی ہیں کہ پھولوں کی کثرت کی وجہ سے درختوں پر بلبل کے آشیانہ بنانے کی جگہ نہیں بچی ہے اور اسے زمین پر اپنا ڈیرا جمانا پڑا ہے۔ گل ولالہ زمین پر اس طرح بکھرے ہوئے ہیں جیسے وہ چمن کے زمین پر لنڈھائے ہوئے جام ہیں اور سبزہ، بنفشہ پر یوں جھکا ہوا ہے جیسے کوئی مسن ومعمر کسی برنا کی گوشمالی کررہا ہے۔ برسات کی ہوا مرہم صفت ہوتی ہے جو زخموں کا مداوا کرتی ہے اگر یقین نہ ہو تو کسی درخت سے کوئی شاخ توڑ لو برسات کی ہوا کے فیض سے وہاں ظاہر ہوا زخم فوراً مندمل ہوجائے گا اور دوسری شاخ نکل آئے گی۔ کلیم کے الفاظ میں:

☆ سحاب آراست باغ و بوستان را — فدای باغبان کن جان و مان را
☆ چنان گلبن گرانبارست از گل — کہ بلبل بست بر خاک آشیان را
☆ در این موسم کہ صحراھا بہشت ست — بفرزندان رہا کن خان و مان را
گل و لالہ کہ میغلطند بر خاک — تنگ ظرفند گو پا بوستان را
بروی سبزہ می غلطد بنفشہ — عجب پیری کہ می مالد جوان را
☆ ہوای برشگالی مومیائیست — ز گلبن شاخ بشکن امتحان را

بہار گلشن فردوس خواہی درین موسم بہ بین ہندوستان را

(دیوان کلیم، ص ۵۷۔۵۸)

ہندوستان سے کلیم کی دلباختگی کا فسانہ وہ قصیدہ بخوبی بیان کرتا ہے جس میں اس نے اپنے ممدوح کی مدح سے قبل ہندوستان کے اوصاف تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ہندوستان کے لئے ''دیدۂ بددور'' کی ترکیب استعمال کر کے جنون کی حد تک ہندوستان سے اپنے ربط دل کا اظہار کرتا ہے۔ کلیم ہندوستان کو ایسا عشرتستان قرار دیتا ہے جہاں شگفتگی دل اور کشادگی طبع کی ارزانی وفراوانی ہے، جس سے دنیا کے رخسار کی زینت ہے، جس کے دلکش حصار واطراف عروس جہاں کے رخ زیبا پر بل کھاتی ہوئی سیاہ زلفیں ہیں، جو امنیت وعافیت کے اقلیم کا پایۂ تخت ہے، جو خلق ومروت اور دلجوئی ودلداری کی صفات سے مالا مال ہے، جس کے قشقہ برداروں اور زنار بدوشوں کا دل اس اعتبار سے مسلمان ہے کہ حقیر چیونٹی کی دل شکنی اور آزار بھی انہیں گوارا نہیں اور جہاں کے پرندے بھی زبان داں ورمز آشنا ہیں۔ ہندوستان کا یہ نقش حسین کلیم کے اس قصیدے کی ہر ہر بیت میں نظر آتا ہے جو یوں شروع ہوتا ہے:

ز ہند دیدۂ بددور عشرتستانست دل شگفتہ و طبع گشادہ ارزانست

ازوست زینت عالم کہ روی دنیا را سواد دلکش او عنبر افشانست

کلیم ہندوستان کو عیش وراحت کا ایسا ملجا وماویٰ سمجھتا ہے جس کی خاک سے مرادیں بہ آسانی بر آتی ہیں، جس کے ایک شہر اکبرآباد یعنی آگرہ میں جمعیت قلبی اور مسرت وشادمانی وفور کے ساتھ نظر آتی ہے۔ کلیم آگرہ کے گلی کوچوں پر ہزاروں امصار واقطار قربان کرنا چاہتا ہے۔

گنگا کی طرح شہر آگرہ کا دریا بھی موجزن ہے جس کی مساحت ناممکن ہے آگرہ ایسا مرفہ ومعمور شہر ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ہے، جہاں سات اقلیم کے لوگوں کی سمائی ہے، جہاں مودی کی دکان میں ساری کائنات کا سرمایہ موجود ہے، جس کے طول وعرض سے گذرنے میں آفتاب کو زیادہ وقت درکار ہے اور نصف شب کے قریب جا کر آگرہ میں شب حکمراں ہو پاتی ہے۔ نمونتاً چند شعر ملاحظہ ہوں:

☆ خوشا ہندوستان ماوای عشرت سواد اعظم اقلیم راحت

☆ متاع خاطر جمع و دل شاد بسی ارزان بود در اکبرآباد

☆ ہزاران مصر در ہر کوچہ اش گم چو گنگش رودہای پر تلاطم

سواد او گرفتہ صفحۂ ارض نہ طول از منتہاش آگاہ و نہ عرض

☆ چو خور بیرون شود از ملک گردون رود شب درمیان از شہر بیرون

☆ چنین شہری بعالم کس ندیدست کہ دروی ہفت اقلیم آرمیدست

(دیوان کلیم،ص۳۴۱۔۳۴۰)

کلیم نے اپنی اس مثنوی میں مختلف گروہ محترفہ کا بھی دلکش بیان کیا ہے۔ بزاز محبوبوں کا سا انداز رکھتا ہے اور اپنے دیبائے چینی پر اتراتا ہے، سنار بھی کسی معشوق سے کم نہیں جو ہم جیسے لوگوں کے نقد قلب کو خاطر میں نہیں لاتا، پنواری پر سبھی شیدائی ہیں جو پان کی گلوری کی طرح اپنے اوصاف پر پیچاں وفرحاں ہے، درزی خوبصورت لباس والا وہ محبوب ہے جس کا سروقد عاشق فریب ہے اور اور دھوبی بھی اپنے دھلے ہوئے بے پردہ اور ہم برہنہ حسن کے ساتھ دریا کے کنارے ہمیشہ سرو کی مانند کھڑا عاشقوں کے دل لوٹتا رہتا ہے۔کلیم یوں نغمہ سنج ہے:

☆ قماش دلبری بز از دارد کہ بردیبای چینی ناز دارد
☆ بت صراف با صد عشوہ و ناز بنقد قلب ما کی بنگرد باز
☆ ز تنبولی دلی دارم ہمہ ریش ز غم پیچیدہ ہمچون بیرہ بر خویش
☆ بت خیاط شوخ جامہ زیبست صنوبر قامتی عاشق فریب ست
☆ ز حسن شستہ دوبی چہ گویم از آن بی پردہ محبوبی چہ گویم
ترو تازہ شگفتہ آشنا روی بسان سرو، دایم بر لب جوی

(دیوان کلیم،ص۳۴۶۔۳۴۳)

ان پیشہ وروں اور محترفوں کے ذکر کے بعد کلیم کی طبع جولاں آگرہ کے سروقامتوں کے ذکر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔آگرہ کے بازاروں کی چہل پہل تو ان نازنینوں کے دم قدم سے ہے جو گھروں سے آکر خریداری کرتی ہیں۔ شاہراہوں پر کہیں بتان راجپوت ہیں،تو کہیں سمنبران شیوخ، کہیں دوشیزگان افغان ہیں،تو کہیں مہوشان ترک جو حسن و جمال اور عشوہ طرازیوں میں دوسرے بتان ناز کے باعث رشک وحسد ہیں۔کلیم کہتا ہے:

☆ بتان راجپوت و شیخ زادہ شکیب عاشقان بر باد دادہ
ہمہ افغان بسیر عاشق نظارہ بدستی زلف و در دستی کنارہ
☆ قضا روزی کہ نقش خیر و شر بست بخوبی راجپوتان را کمر بست

(دیوان کلیم،ص۳۴۳)

اسی طرح اپنی ایک دوسری مثنوی میں ہندوستان کا وصف کرتے ہوئے کلیم اسے ایسا مقام ناز قرار دیتا ہے جو دارالاماں کی طرح فراخ دل اور وسیع قب ہے۔اس کی نگاہ میں ساری دنیا ایک گوشے کی مانند ہے اصل تو صرف ہندوستان

ہے، دنیا کے دوسرے تمام ممالک خوشوں کی مانند ہیں اور ہندوستان خرمن مثال ہے۔ ہندوستان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کی بزم میں سارا جہان زانو بہ زانو بیٹھ جائے تو بھی کسی کے لئے جگہ تنگ نہ ہو۔ کلیم اس مثنوی میں یوں نغمہ سنجی کرتا ہے کہ:

☆ بجز ہندوستان عشرت انگیز کجا یابی بدینسان ملک زرخیز
بنازم وسعت ہندوستان را گشادہ عرصۂ دارالامان را
جہاں ہند است وغیر از وسعت گوشہ ہمین خرمن بود، باقیست خوشہ
☆ بہ بزم ہند اگر عالم نشیند کس از پہلوی کس تنگی نہ بیند

(دیوان کلیم، ص ۳۹۸)

اجمالاً یہ کہ فارسی نثر و شعر میں ہندوستان کی مدحت و توصیف کی گنگا و جمنا اور فضل و مناقب کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن ہے اور یہ ہندوستان کے دو بڑے عاشقوں کی زبان سے بیان ہونے والی تعشق ہندوستان کی داستان کا نمونہ تھا:

تا طبع نازکت نہ پذیرد ملالتی این بہ کہ نامہ را بہ دعا مختصر کنم

☆☆☆

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی
شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

میرِ کاروانِ تحقیقِ فارسی: صباح الدین عبدالرحمٰن

چکیدہ : سید صباح الدین عبد الرحمٰن اپنے زمانہ کے بہترین محقق، مورخ و نقاد گزرے ہیں، ان کی ولادت بہار میں ہوئی، مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید تھے اور دیار شبلی یعنی دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ سے زندگی بھر وابستہ رہے۔ فارسی ادب میں ان کی خدمات بیش بہا ہیں، انہیں ان کی عہد مغلیہ پر لکھی گئی ادبی تصنیف بزم تیموریہ کی وجہ سے شہرۂ دوام حاصل ہوا، اس کے بزم مملوکیہ اور امیر خسرو پر ایک نظر ان کی دیگر مشہور تصانیف میں سے ہیں۔ آخر وقت تک دار المصنفین کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے، ان کی تصانیف کے کئی زبانوں میں تراجم بھی ہوئے لیکن تمام تصانیف میں بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

کلیدی الفاظ: سید صباح الدین عبد الرحمٰن، دار المصنفین، عہد مغلیہ، شاعری، تاریخ، بزم مملوکیہ، خسرو

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۱۹۱۱ء میں بہار کی مردم خیز بستی دسنہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ جنہیں سید سلیمان صاحب کا ہموطن ہونے کا شرف حاصل ہے سید صباح الدین ابھی شکم مادری میں ہی تھے کہ انکے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا اور سات سال کی سن کو پہونچے تھے کہ مادر محترمہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا دادا اور دوسرے عزیزوں نے بڑے ناز و پیار سے آپ کی پرورش کی کسی قسم کی محرومی کا احساس ہونے نہ دیا۔ سید صباح الدین کے خاندان میں کئی پشتوں سے جدید تعلیم کا رواج تھا اسلئے خاندانی روایت کے مطابق انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں حاصل کی اسکے بعد 'نالند کالیجیٹ اسکول' میٹرک اور پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ کر کے علی گڑھ کا رخ کیا جو اس زمانے میں اہل دماغ کا مرکز تھا انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے بی۔ایڈ۔ کیا اسکے بعد پھر انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو و فارسی میں ایم۔اے۔ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تاریخ کے مضمون میں گریجویٹ کا دو سالہ خصوصی مطالعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ٹریننگ کالج سے کیا کچھ عرصہ تک جامعہ اسلامیہ دہلی میں پروفیسر مجیب صاحب کے زیر نگرانی تحقیق کے کام میں مصروف رہے اسی دوران سید سلیمان صاحب کی خواہش پر ۱۹۳۵ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ آ گئے۔ اس طرح دار المصنفین اعظم گڑھ کو دسنہ نے دو

لائق وفائق فرزند دئے ہیں جن میں سے ایک تو سید سلیمان ندوی صاحب اور دوسرے سید صباح الدین صاحب کی شخصیت تھی۔ دارالمصنفین سے سید صباح الدین صاحب کو ایسا لگاؤ پیدا ہوا کہ انہوں نے اسے ہی اپنا وطن اپنا خاندان اور اپنا آخری مسکن بنالیا اور یہ وصیت بھی فرمائی کہ انہیں وفات کے بعد اسی احاطہ میں علامہ شبلی نعمانی کے پہلو میں دفن کیا جائے۔

سید سلیمان صاحب کو صباح الدین سے بہت امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں ایک خط میں سید صباح الدین صاحب کو حیات شبلی ۴۲۵ پر لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ قادیر دارالمصنفین کی خدمت کا موقع دے اب تم سے اور برادرم شاہ معین الدین ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں تم لوگوں کو ہر طرح سے دارالمصنفین کا چراغ روشن رکھنا ہے اور ہاں بھائی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے سلسلہ کو بھی جاری رکھو اللہ تبارک تعالیٰ اسے پورا فرمائے۔''

نیا دور لکھنو مارچ ۱۹۸۸ صفحہ ۱۲۹ پر عبدالقوی دسنوی نے اپنے ایک مضمون 'سید صباح الدین عبدالرحمٰن کچھ باتیں اور کچھ یادیں' میں انکا سراپا کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

''میں نے پہلی بار انکو ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں ہوش کی آنکھوں سے دیکھا۔ دراز قد، کلین شیوڈ، گندمی رنگ، چوڑی پیشانی، کھڑی ناک، روشن آنکھیں، چھریرا بدن، شیروانی میں ملبوس پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، سر پر ٹوپی، کم گو، سنجیدہ، پروقار شخصیت کے مالک یہ تھے اس وقت کے سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔''

۲۰۔۲۱ فروری ۱۹۶۵ء کو جب دارالمصنفین کی طلائی جوبلی منائی گئی تو اس جشن کے انتظامیہ میں سید صباح الدین پیش پیش تھے اور اسکے کامیابی کے تاثرات کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میری زندگی کی تمنائیں یہ تھیں کہ مصنف نبوی سید سلیمان کا شاگرد بن کر دارالمصنفین کا ادبی خدمت گزار بنا رہوں اور دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کا جشن اپنے محترم بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں انجام دوں یہ ساری تمنائیں پوری ہوگئیں اگر ذاکر صاحب اپنے ہوائی اڈے پر پہنچ کر میری وفات کی خبر سنیں تو میرے لئے کوئی غم نہ کریں۔'' (نیا دور ۱۵۴)

۱۸، نومبر ۱۹۸۷ء کو پرستار شبلی سید صباح الدین کا انتقال ہوا عجیب اتفاق ہے کہ ترسٹھ سال قبل دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی کا بھی اسی تاریخ کو انتقال ہوا تھا۔

وفات: حادثہ کا تفصیل یہ ہے کہ مرحوم کو اچانک مولانا مفتی رضا انصاری صاحب سے ملاقات کیلئے فرنگی محل جانے کا تقاضا پیدا ہوا سید شہاب ادین صاحب دسنوی نے کہا کہ میں نے ابھی تک فرنگی محل نہیں دیکھا ہے مجھے بھی شوق ہے دونوں دارالعلوم سے ایک رکشہ پر سوار ہوئے ڈالی گنج کے پل تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ رکشے کے سامنے اچانک ایک گائے آگئی رکشہ والے

نے رکشہ روکا جس سے ایک جھٹکا لگا سید صاحب غالباً اس وقت محو گفتگو تھے اچانک سر کے بل نیچے گر گئے سر پر چوٹ آئی اسی وقت ایک ٹرک بھی آ گیا اس نے برک لگایا مگر اسکا ایک پہیہ انکے سر سے لگ گیا جس صدمہ میں مزید اضافہ ہوا شہاب الدین صاحب نے انہیں فوراً میڈیکل کالج لکھنو کے ایک اسپتال میں پہنچایا جہاں ڈاکٹروں نے دیکھکر انتقال کی افسوسناک خبر دی کسی طرح لوگوں نے پوسٹ مارٹم کے قانونی مرحلہ سے بچالیا عشاء کے وقت نعش کی گاڑی پر اساتزہ اور طلبہ کی ایک جماعت سید شہاب الدین صاحب کی معیت میں علم وشرافت کے اس گنج گراں مایہ کو اعظم گڑھ کیلئے رخصت کیا گیا۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے انکی نماز جنازہ پڑھائی اور انکی خواہش اور وصیت کے مطابق دارالمصنفین میں علامہ شبلی نعمانی کے لحد کے کنارے دفن کیا گیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے مضمون 'سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی وفات ایک عظیم حادثہ' میں مرحوم کی خواہش مزاجی اور عالمانہ ظرافت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''وہ رونق محفل ہوتے تھے اور اپنے وسیع تاریخی مطالعہ، متنوع معلومات، اور لطائف وظرائف سے مجلس کو باغ وبہار بنادیتے تھے۔'' (نیا دور ۱۰۴)

بزم تیموریہ: سید صباح الدین صاحب مرحوم کی یہ تصنیف اپنے اسلوب کے لحاظ سے جداگانہ تصنیف ہے ان سے قبل مورخین نے تیموری عہد کے خوفناک افسانے اور غارت گری کی داستانیں بیان کی ہیں جسکی وجہ سے تیموریوں کے علمی ادبی کارنامے تاریکیوں میں پوشیدہ رہے سید صاحب نے اسکے برعکس تیموری سلاطین کی علمی خدمات کا مرقع پیش کیا ہے اول فصل فرمانروا بابر سے لیکر خاتم مغلیہ سلطنت بہادر شاہ ظفر نیز شہزادے اور شہزادیوں کی حالات زندگی کی مرقع آرائی کی ہے بادشاہوں کے دربار سے متعلق علماء ادباء رؤساء اور ارباب کمال وفن کا تذکرہ مع مثال پیش کیا ہے۔

اس تصنیف کے تین حصے ہیں پہلا حصہ بابر، ہمایوں اور اکبر پر مشتمل ہے دوسرا حصہ جہانگیر اور شاہجہاں پر مشتمل ہے اور تیسرے حصے میں عالمگیر تا بہادر شاہ ظفر نیز شہزادے اور شہزادیوں کی معرکہ آرائی کی گئی ہے اس کتاب کی اشاعت ۱۹۴۸ء میں دارالمصنفین سے ہوئی۔ سید سلیمان ندوی اس کتاب کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

''تیموری سلاطین رزم وبزم دونوں میدانوں کے مرد تھے وہ جس درجہ کے فاتح اور کشور کشاں تھے اسی درجہ کے علم پرور اور ادب نواز بھی۔ ان کے دور ہنگامہء کارزار کے ساتھ ساتھ علم وادب کی محفل بھی گرم تھی ان کا دربار ہر فن کے اصحاب کمال علماء وشعراء کا مخزل تھا اور انکی سرپرستی میں بہت سے علمی اور ادبی کام انجام پائے لیکن اس زمانے میں تاریخ نویسی کا مزاق ایسا تھا کہ مورخین سارا زور قلم فتوحات اور کشور کشائی کی داستان میں صرف کر دیتے تھے اور علم وادب کے حالات کی جانب انکی توجہ کم رہتی تھی تاہم اس دور کی تاریخیں اس ذکر سے خالی بھی نہیں ہیں لیکن رزم کے مقابلہ میں انکے نقوش اس قدر دھندلے اور پراگندہ ہیں کہ ان کا پورا مرقع نظر آتا ہے۔''

سید صباح الدین نے بزم تیموریہ میں اسی مرقع کو مرتب اور مربوط طریقے پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید صباح الدین صاحب اس کتاب کے آغاز میں بابر کے متعلق رقمطراز ہیں:

ظہیر الدین محمد بابر نہ صرف ایک عظیم الشان سپاہی، عظیم المرتبت فاتح، ابوالعزم بادشاہ تھا بلکہ ارباب بصیرت نے اسکو ایک بلند پایہ اہل قلم اور قابل قدر شاعر بھی تسلیم کیا ہے وہ تیموریوں کی چھٹی نسل میں تھا ترکہ میں میدان کارزار کی پامردی وشجاعت کے علاوہ علم وثقافت سے شیفتگی وہ دلدادگی بھی پائی تھی ملک گیری وکشور کشائی کی معرکہ آرائیوں کے ساتھ ساتھ اس نے علم وفن کی انجمن آرائی بھی اس طرح کی جس طرح ایک تاج وتخت کے مالک کو کرنا چاہئے چنانچہ ارباب فضل وکمال خلوت وجلوت بلکہ میدان جنگ میں بھی اسکے ساتھ رہے جن کا ذکر اس نے اپنی تزک میں کیا ہے۔

سید صباح الدین نے بابر کی شخصیت کا مطالعہ بہت ہی گہرائی سے کیا اور اسکی شجاعت وعلمیت کا اعتراف کیا کہ ترکی وفارسی زبان پر اسکو عبور حاصل تھا وہ بہت ہی معروف معارف پرور اور علم دوست انسان تھا اسکے علمی کارنامے 'بزم تیموریہ' کے تیس صفحات پر مشتمل ہیں اس کتاب میں بابر کی علمیت اور مشاہدات کو حد درجہ تسلیم بخش بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس میں جابجا اسکی نثر ونظم کا حوالہ بھی دیا گیا ہے ان حوالوں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ مغل بادشاہ رزم وبزم کی معرکہ آرائی کے علاوہ علماء ومشائخ کی مجلسوں ادباء وشعراء کی محفلوں اور بزم کی نکتہ آفرینی سے بخوبی واقف بھی تھے اور شائق بھی۔ بابر کو شعر وشاعری سے بہت لگاؤ تھا وہ اپنے ہم عصر شعراء سے مراسم رکھتا تھا انکے کلام کا مطالعہ عمیق نظروں سے کرتا تھا اور ان پر تنقید وتبصرہ بھی کرتا تھا اس سے اسکی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ علی شبیر نورانی کے بارے میں لکھتا ہے:

علی شبیر بیگ بے نظیر آدمی تھا ترکی زبان میں شعر کہتا تھا اور ایسا کہتا تھا کہ دوسرا کیا کہیگا۔ اس نے چھ مثنویاں لکھیں پانچ تو خمسہ کے جواب میں ہیں اور منطق الطیر کے وزن پر لسان الطیر لکھی ہے غزلوں کے چار دیوان مدوّن کئے ہیں۔ ''(بزم تیموریہ ۸)

ایک دوسرے شاعر شیخم بیگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اس نے اپنا نام سہیلی رکھا تھا اس لئے شیخ سہیل مشہور ہوگیا۔ اس قسم کا شعر کہتا تھا جس میں ڈراونے الفاظ و معانی ہوں۔''(بزم تیموریہ ۲۵)

بابر اپنے ہم عصر اور درباری شعراء کے اشعار بھی بغور پڑھتا تھا۔ اور اس پر تنقید وتبصرہ بھی کرتا۔ اس نے آصفی صفی بخاری کے اشعار پر بڑا ہی مفصل تبصرہ کیا ہے۔ تزک بابری جسکا شمار دنیا کے بہترین علمی وتاریخی سرمایہ میں کیا جاتا ہے بابر نے اپنی مادری زبان ترکی میں لکھی ہے اور ایسا سلیس وشگفتہ انداز بیان اختیار کیا کہ یہ کتاب اپنی مثال آپ رکھتی ہے۔ تزک بابری فصاحت وبلاغت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

''واقعات خود را از ابتداء سلطنت خود تا حال اتحال از قرار واقع بے عبارت فصیح و بلیغ نوشتہ اند۔'' (بزم تیموریہ ۳۰)

ہمایوں: تیموریوں کی علم نوازی اور علم پروری انکی نسل میں برابر منتقل ہوتی رہی چنانچہ بابر کے بعد جب ہندوستان کا بادشاہ بنا تو اسکے دربار میں بھی شعراء ادباء وحکماء کی بھیڑ رہتی تھی یہ اسکی علم نوازی اور معارف پروری کی دلیل ہے۔ ہمایوں کی زیادہ تر زندگی جنگ وجدل میں گزری پھر بھی فرصت کے اوقات میں شعروسخن کا مشغلہ جاری رکھتا تھا۔ اسکی مادری زبان ترکی تھی مگر اس نے شاعری فارسی زبان میں کی اس نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن اسکی شاعری میں غزل ورباعی کثرت سے ملتی ہیں وہ اپنے بھائی مرزا کامران کی عیاریوں کو اپنی ایک رباعی میں اس طرح پیش کرتا ہے:

در آئینہ گر چہ خود نمائی باشد پیوستہ ز خویشتن جدائی باشد
خود را بنمائی غیر دیدن عجب است این بوالعجمی کار خدائی باشد

ہمایوں کے شعروسخن کے ذوق کے سبب اس زمانے کے شعراء شاہی انعام واکرام سے فیضیاب ہوتے تھے بدایونی کا بیان ہے:

''شعرائے بسیار نادرہ ءروزگار از دامن او برخاستہ اند۔'' (بزم تیموریہ ۲۳)

ابوالفضل 'اکبرنامہ' میں ہمایوں کے شاعری کے ذوق کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

''وہ توجہ عالی بہ شعر وشعراء نیز دانستند و از انجا کہ طبع موزوں از خصائص فطرت سلیم است۔'' (بزم تیموریہ ۳۸)

ہمایوں کے دربار میں فضلاء کی تعداد بھی شعراء سے کم نہ تھی طبقات اکبری میں ہے کہ:

''درصحبت آن مقتدای جہاں ھمہ وقت فضلاء علماء واکابر بودند وھمہ از اوّل شب تا بصبح بہ نصیحت می گذشت او نہایت آداب در مجلس آنحضرت مرعی می بود وھمہ وقت بحث علمی مذکور مجلس بہشت آئین می گشت ارباب فضل و ہنر را در عہدش رونق پدید آمد'' (بزم تیموریہ ۳۸)

اکبر: اکبر کے متعلق بہت سے مورخین کی رائے ہے کہ وہ امّی محض تھا لیکن بزم تیموریہ کے مصنف کے نزدیک یہ خیال درست نہیں کیونکہ ہمایوں اکبر کی تعلیم کی سخت نگرانی رکھتا وہ جب چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہوا تو اسنے مکتب کی رسم ادا کی ابوالفضل مکتب کی رسم کی تقریب کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

''در ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر بد پیوند حضرش شہنشاہی چہار سال و چہار ماہ و چہار روز شدہ بود بہ آئین رسم و عادت آن آموختہ درسگاہ الٰہی در موزدان بستان ربانی را در مکتب بشری در آوردند و ملا زادہ ملا عصام الدین ابراہیم را باین

خدمت گرامی شرف اختصاص بخشند۔'' (بزم تیموریہ ۹۰)

اکبر کا علمی وادبی ذوق اتنا بلند ہو گیا تھا کہ وہ خود اشعار بھی کہنے لگا تھا۔ ابوالفضل رقم طراز ہے:

''وطبع الہام پذیر آنحضرت بگفتن نظم ہندی وفارسی بغایت موافق افتادہ در دقائق تخیلات شعری نکتہ سنجی وموشگافی فرمائیند۔'' (بزم تیموریہ ۱۰۴)

تاریخ فرشتہ میں ہے:

''اگر چہ خط سواد کامل نداشت اما گاہی شعر گفتی ودر علم تاریخ وقومی تمام داشت وقصص ہند نیکوئی دانست۔'' (بزم تیموریہ ۱)

اکبر کی علم وفن سے دلچسپی کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ اسکے دربار میں ایسے ایسے ارباب کمال جمع ہو گئے تھے جو کسی ایک عہد یا ایک دربار میں مشکل سے ہی ملتے ہیں اسکے دربار میں 'سنگھاسن بتیسی' کا ترجمہ عبدالقادر بدایونی نے کیا ۔ چوتھے وید کا فارسی میں ترجمہ ہوا اکبر کی فرمائش پر خانخاناں عبدالرحیم خان نے کیا۔ مہابھارت اور رامائن کلیلہ ودمنہ کا بھی فارسی میں ترجمہ ہوا ان تمام علمی وادبی سرگرمیوں کا بڑا ہی اچھا مرقع اس کتاب میں سید صباح الدین نے پیش کیا ہے جو کہ ادبی دنیا میں ایک قابل اضافہ ہے۔ اس کتاب نے اکبر کے سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ علمی وادبی بصیرت کو بھی ظاہر کیا جو کہ ابھی تک پوشیدہ تھی اس دور کے علماء فضلاء ادباء وشعراء کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوالفیض فیضی، ابوالفضل، صدر الصدور، شیخ عبدالنبی، ملا عبدالقادر بدایونی، نظیری نیشاپوری، عرفی شیرازی، خواجہ حسین ثنائی، ظہوری، امیر ابوالفتح گیلانی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

جہانگیر: جہانگیر کے متعلق سید صباح الدین رقم طراز ہیں:

''جہانگیر دعاؤں سے پیدا ہوا حوصلوں اور تمناؤں میں پلا ناز ونیاز کے ساتھ بڑھا ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم و کمال کے گہوارے میں پایا جب چار سال چار مہینے اور چار روز کا ہوا تو علم پرور باپ نے اسکی رسم مکتب ادا کی۔'' (بزم تیموریہ ۱۵۴)

جہانگیر فارسی زبان کا ایک بہترین انشاء پرداز تھا تزک جہانگیری اسکا علمی شاہکار ہے جو سادگی، سفائی اور بے ساختگی کے لحاظ سے بے مثل ہے جہانگیر شعروادب کا بھی دلدادہ تھا اور اپنے آباواجداد کی طرح شعراء وادباء کی بھی سرپرستی کرتا تھا۔ اسکی غزلیں سلاست ورنگینی سے پر تھیں ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

من چوں کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد — تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد

مستانہ می خرامی و مست تو عالمی — اسپند می کنم کہ مباد النظر رسد

در وصل دوست مستم و در ہجر بیقرار داد از چنین غمی کہ مرا سد بسر رسد

یہ اشعار یہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ ایک بادشاہ ہی نہیں بلکہ ایک بلند مرتبہ شاعر بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ اسکے دربار میں شعراء ادباء علماء کی بھیڑ تھی اور یہ سلسلہ اسکی شہزادگی کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا طالب آملی اسکے دربار کا ملک الشعراء تھا اور دیگر شعراء کے نام حسب ذیل ہیں:

میر سنجر، عرفی، نظیری، ملا شیدا، حیاتی گیلانی، شکیبی اصفہانی، حسن بیگ خاکی، عطائی معنوی، وغیرہ یہ شعراء زبان فارسی کے انتہائی مشہور و معروف شعراء ہیں۔ ان شعراء کے علاوہ اسکے دربار میں علماء و فضلاء کی بھی بڑی تعداد تھی، چند کے نام اس طرح ہیں:

ملا نور اللہ شوستری، حضرت مجدد الف ثانیؒ، مولانا نفیا بی شوستر وغیرہ بڑے ہی عالم بزرگ تھے جو کہ اسکے دربار سے منسلک تھے، ان تمام شعراء و فضلاء و علماء کا ذکر اس کتاب میں دلآویز طریقے سے کیا گیا ہے اور تزک جہانگیری کے ادب و انشاء پر بڑا ہی سیر حاصل تبصرہ ہے جس سے اسکی علم دوستی اور معارف پروری اجاگر ہوتی ہے۔

شاہ جہاں: خاندانی روایت کے مطابق جب وہ چار سال چار مہینے اور چار روز کا ہوا تو پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا۔ قاسم بیگ تبریزی، حکیم گیلانی، شیخ ابوالخیر اور وجیہ الدین گجراتی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ انہیں اساتزہ کے زیر نگرانی شاہجہاں نے علوم و فنون کی تکمیل کی۔ اسکے ذوق لطافت، نفاست اور کارناموں کے متعلق سید صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

''اگر ہم بابر کی ذہنی نقش آرائیاں اسکی تزک بابری میں، ہمایوں کی تخیل آرائیاں اسکی شاعری میں، اکبر کی علمی فیاضیاں اسکے دربار کے ہنر پرور فضا میں، اور جہانگیر کی رنگینیاں اسکی تزک جہانگیری میں پاتے ہیں تو شاہ جہاں کے ذہن کی پرکاریاں اسکے تخت طاؤس، قلعہ معلیٰ، اور روضہ تاج کے نقش و نگار سے عیاں ہیں۔'' (بزم تیموریہ ۲۵۵)

اگر چہ شاہ جہاں نے بابر، ہمایوں اور جہانگیر کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اسکی زندگی علمی دلچسپیوں سے خالی بھی نہیں اگر چہ اس نے اپنا زیادہ تر وقت تعمیری کاموں میں صرف کیا لیکن اسکی فیاضیوں اور زر پاشیاں اسکے علم دوست اور معارف پرور ہونے کا ثبوت دیتی ہیں اور یہی وجہ تھی کہ اسکے دربار میں بے شمار ادباء علماء فضلاء مورخین اور شعراء موجود تھے شعراء کے نام حسب ذیل ہیں:

حاجی محمد جان قدسی، ابو طالب کلیم، مرزا محمد علی صائب، ظفر خان احسن، مرزا محمد طاہر آشنا، مرزا المان امانی، سلطان شادمان، شیخ محمد حسن فانی، محمد حسین آشوب، میر الٰہی ہمدانی، امی شیرازی، حکیم حاذق گیلانی، میر یحیٰ کاشی، مرزا رضی دانش، مرزا حسن بیگ، میر مہدی طہرانی، انکے علاوہ چار ہندو شعراء بھی تھے جنکے نام اس طرح ہیں چندر بھان برہمن، سندر، چنتامنی، راجہ سنبھو ناتھ سنگھ اور یہ اتنی ہی تویل فہرست فضلاء اور خوش نویسوں کی بھی ہے انکے نام بھی پیش ہیں:

محمد فاضل عبدالسلام دیوی، قاضی محمد اسلم ،محمد زاہد، میر محمد ہاشم، امین قزوینی، محمد وارث، جلالی طباطبائی، میر عمادالحسن قزوینی، عبدالرشید دیلمی، فرید دہلوی وغیرہ وغیرہ ان تمام شعراء وفضلاء کے احوال وآثار اور ادبی خدمات کا اس کتاب میں مفصل ذکر کیا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر غازی: رزم وبزم مستقل تیموری نسل میں منتقل ہوتی رہی اور انکی نسلیں ان دونوں میدانوں میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی تھیں انکی تعلیم خاندانی روایت کے مطابق ہوتی تھی علمی ادبی ذوق اور زر پاشیاں انہیں ورثے میں ملی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ انمیں ہمیشہ سے علمی لگاؤ تھا اور اسی ذوق شوق نے انکے درباروں میں شعراء علماء فضلاء کی بھیڑ اکٹھا کر دی تھی جن لوگوں نے غزل قصیدہ اور مثنوی سے بادشاہ کا دل بہلایا اور علمی دنیا میں بھی گراں قدر اضافہ کیا اور بادشاہ کی فیاضیوں سے اپنا دامن بھی لعل وگہر سے بھر لیا اور بادشاہ کے ہمراہ سفر اور حضر میں عیش بھی کیا۔ اس تیموری نسل کا ایک فرزند بادشاہ عالمگیر بھی تھا جو چار زبانوں سے واقف تھا عربی، فارسی، ترکی اور ہندوستانی وہ اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز تھا۔ اسکا شمار فارسی کے ممتاز ترین ادیبوں اور انشاء پردازوں میں کیا جاتا ہے۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ اسکی فیاضیاں اور زر پاشیاں اہل کمال وفضل پر عام تھیں وجہ تھی کہ اسکے دربار میں اہل فضل وکمال دور دور سے آکر جمع ہو گئے تھے اسکے دربار سے متعلق چند شعراء اور فضلاء کے نام حسب ذیل ہیں:

نعمت خان عالی، عاقل خان رازی، محمد سعید اشرف، رفیع خان بازل، غلام علی بخش، محمد علی ماہر، محمد افضل سرخوش وغیرہ اور انکے علاوہ چند ہندو فضلاء اور شعراء بھی دربار سے وابستہ تھے جنکے نام اس طرح ہیں۔ ہندی کا مشہور رزمیہ شاعر بیر داس اور بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی، وامق کھتری، بھیم سین کائستھ، سوجان رائے کھتری اور اور رائے بندرابن تھے جو کہ بہت ہی مقبول ومشہور ہوئے تھے ان تمام حضرات کا ذکر سید صباح الدین صاحب نے اس کتاب میں جامع طور پر کیا ہے اور انکی ادبی علمی تحقیقی خدمات پر روشنی ڈالی ہے جس سے اس عہد کی اہمیت اور کتاب کی جامعیت میں بہت ہی اضافہ ہوا ہے۔

اورنگ زیب اور اسکے بعد کے تخت نشین: اورنگ زیب کی وفات دراصل مغلیہ حکومت کے زوال کی ابتداء تھی جسکا خاتمہ بہادر شاہ ظفر پر ہوا۔ بزم تیموریہ کے مصنف سید صباح الدین رقم طراز ہیں کہ:

''اورنگ زیب کی روح قفس عنصری سے پرواز کرتے ہی تاریخ ہند کا رخ بدل گیا ہمالیہ سے کنیا کماری تک پھیلی تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے عالمگیر کا دل ودماغ چاہئے تھا مگر حکومت بدلنے کے ساتھ ساتھ زمانہ بدلا اور تاریخ بھی بدل گئی تخت طاؤس وہی تھا مگر اسکے پروں کی خوشنمائی جاتی رہی تیموری دربار وہی تھا مگر اسکی رونق جاتی رہی۔ ارباب عقل ودانش بھی موجود تھے مگر انکی جودت، عطانتا ورسیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا دیوان خاص کے

کنگوروں سے حسرت و یاس برسنے لگی دیوان عام کی دیواروں پر افسردگی چھا گئی قلع معلیٰ سوگوار ہو گیا معلوم نہیں یہ کارکنان قضاء وقدر کی مصلحت تھی یا عالمگیر کی اولاد کے اعمال کی پاداش تیموری سلطنت اوج کمال پر تھی اسکے زوال کو روکنے کے لئے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی مگر وہ قوت باقی نہ تھی فطرت سرگرم کار ہوتی اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم بابل نینوا کا ہو چکا تھا۔'' (بزم تیموریہ ۲۹۴)

محمد شاہ نے فارسی کے بجائے ہندوستانی زبان میں اپنے علمی ذوق کا اظہار کیا ایک بارہ ماسہ انکے نام سے منسوب ہے انکے زمانے میں بھی فارسی شعراء کی تعداد بہت زیادہ تھی جسمیں چند نام قابل ذکر ہیں:

قزلباش خاں امید، سلطان قلی خان داور، علی قلی خاں داور، علی قلی خاں ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خاں فراق، میر شمس الدین فخر، سراج الدین علی خاں آرزو، فائض، شہرت، صابر، مخلص وغیرہ ان تمام شعراء کے احوال وآثار اور انکی شعری خصوصیات وادبی خدمات کا ذکر بزم تیموریہ میں خاطر خواہ طریقہ سے کیا گیا ہے۔

سلطان بہادر شاہ ظفر پر مغلیہ حکومت ختم ہوتی ہے اسکے دور میں اردو شاعری بام عروج پر تھی سید صباح الدین صاحب رقم طراز ہیں:

''بہادر شاہ ظفر تیموری سلاطین کا خاتم ہے وہ بادشاہ بنا لیکن حکمرانی کے لئے نہیں بلکہ اپنے اسلوب کی عظمت و سطوت کی یاد میں خون بہانے کے لئے۔'' (بزم تیموریہ ۳۲۲)

اس کتاب کے آخری دو ابواب میں تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی وادبی ذوق پر تبصرہ ہے سید سلیمان صاحب نے یہ دیکھانے کی کوشش کی ہے کہ بابر کا لڑکا مرزا کامران بھی صاحب دیوان شاعر تھا اسکی فارسی شاعری کا تجزیہ ونہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ کیا ہے اسی طرح عسکری، ہندال، دانیال، مراد، پرویز، شجاع، اعظم شاہ، کام بخش، جہاندار، جیسے شہزادوں کی علمی وادبی سرگرمیوں سے بعض مفید معلومات فراہم کئے ہیں اور انہوں نے تیموری شہزادوں کے علمی بزم کا گلِ سرسبد شہزادہ داراشکوہ کو بتایا ہے اسکی تمام تصانیف پر سید صاحب نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے شہزادوں میں مرزا احسن بخش، سلیمان شکوہ، مرزا فرخندہ بخش کی اردو شاعری کے نمونہ بھی پیش کئے ہیں۔

اسی طرح تیموری شہزادیوں میں گلبدن بیگم، گل رخ بیگم، سلیمی سلطان بیگم، عالم بیگ، نور جہاں بیگم، جہاں آراء، زیب النساء وغیرہ کا ذکر ہے انکی علمی وادبی دلچسپیوں کی تفصیل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں نے عورتوں کی تعلیم کا پورا خیال رکھا تھا اور شہزادیاں بھی تعلیم حاصل کر کے علمی وادبی جوہر دکھاتی تھیں۔

اس کتاب کی جامعیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک صاحب کو ایران سے اسکے فارسی ترجمہ پر پی۔ایچ۔ڈی۔کی ڈگری سے نوازا گیا۔۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے ہی مولف کے پاس توصیفی خطوط

آنے شروع ہو گئے اور انکا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔سعید احمد اکبر آبادی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے برھان ۔دھلی ۱۹۴۹۔۶۳ پر لکھتے ہیں:

''یہ کتاب زبان و بیان ترتیب وتدوین کاوش وتحقیق کے اعتبار سے پراز معلومات اور فائدہ بخش ہے،تاریخ اور ادب کے طلبہ اس سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم سابق صدر شعبہ اردو فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے سید صباح الدین صاحب کو اپنے ایک مکتوب مورخہ ۶، مارچ ۱۹۴۹ء میں تحریر کیا:

''جب یہ کتاب مجھکو ملی تو میں نے اسکو شوق سے پڑھا پڑھکر محظوظ ہوا اور آپکی محنت وکاوش کی داد دی آپ نے علم وتحقیق کے دسترخوان پر ایک لزیز چیز رکھکر ارباب علم کے لئے بڑی لذت کا سامان فراہم کر دیا۔''(بزم تیموریہ ۱۰۱)

مولانا ظفر ندوی اس کتاب کے متعلق رقمطراز ھیں:

''یہ کتاب لکھکر مغل بادشاہوں کو پھر سے زندہ کر دیا گیا ہے۔''

جناب ہاشمی صاحب فرید آبادی نے اردو کے ہفتہ وار اخبار (قومی زبان) میں اس کتاب پر ایک مفصل اداریہ لکھا اور اسمیں تحریر فرمایا:

''ہند کا یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک زمانہ تک انگریزوں کی ایک خاص سیاست اور مسلمان کے عام غفلت کے غلاف چڑھے رہے اور مسلمان بادشاہوں کی چھ سو برس کی ساری تاریخ فقط جنگ اور خوں ریزی کی ایک نفرت انگیز داستان بنکر رہ گئی تھی۔''(بزم مملوکیہ ۹)

سید سلیمان ندوی صاحب نے سید صباح الدین صاحب کو ۳۰، دسمبر ۱۹۴۸ء کو ایک نجی خط میں تحریر فرمایا:

''خوشی ہوئی کہ تمہاری کامیاب تصنیف بزم تیموریہ اہل ذوق کو پسند آرہی ہے مجھکو پہلے بزم تیموری پسند نہیں تھی کیونکہ عیش وتنعم کا دلدادہ،شراب وکباب کا متوالا،حسن وعشق کا پرستار،نقش وتصویر اور سرور وساز کا دلدادہ ہی سمجھتا رہا لیکن جو تصویر تم نے کھینچی ہے وہ نحایت عمدہ اور مصور کے کمالات وتعریف کے مستحق ہے۔'' (بزم مملوکیہ ۹)

بزم مملوکیہ: بزم تیموریہ کی طرح یہ تصنیف بھی مسلمان فرمانرواؤں کی علمی تاریخ اور علمی بزم کی مرقع نگاری ہے اس کتاب میں سید صباح الدین صاحب نے ہندوستان کے مملوک یعنی غلام سلاطین امراء اور شہزادوں کی علم دوستی اور معارف پروری کے حالات اور انکے دربار سے متصل علماء فضلاء ادباء وشعراء کے کمالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے بزم تیموریہ تیموری سلاطین کی علمی داستان ہے جبکہ بزم مملوکیہ تیموریوں سے قبل مملوک فرمانرواؤں کی علمی ادبی وتمدنی تاریخ ہے۔

ان سلاطین میں قطب الدین ایبک، ناصر الدین قباچہ،شمس الدین التمش،رکن الدین فیروز شاہ،رضیہ،معز الدین

بہرام، علاءالدین مسعود شاہ اور بغرا خاں کی علم نوازی، معارف پروری، مشائخ سے تعلقات، علماء سے گرویدگی اور شعراء سے محبت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جو اب تک منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ انسلاطین کے عہد حکومت میں قاضی حمید الدین ناگوری، عثمان ہارونی، خواجہ معین الدین چشتی، بختیار کاکی، بابا گنج شکر، نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو کا ذکر مشائخ کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت ۱۹۵۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ہوئی مولف نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''موجودہ جلد ہندوستان کے مملوک یعنی غلام سلاطین اور انکے امراء وشہزادوں کی علم دوستی کے بدولت جو فضلاء و شعراء علم وادب کے افق پر مہر و ماہ بن کر چمکے انکے کمالات کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اس کتاب کا آغاز انہوں نے قطب الدین ایبک سے کیا ہے پہلے اسکے احوال وآثار بیان کئے ہیں پھر ترقی کے مدارج تخت نشینی اور شاہی القاب کا ذکر کیا ہے، اسکے بعد اسکی اصل خوبی شریعت نوازی اور علم نوازی پر تبصرہ کیا ہے۔ قطب الدین ایبک بھی غزنی اور غوری کی روایت کے مطابق علماء فضلاء اور شعراء اپنی سایہء عاطفت میں لیتا تھا اور انکی سرپرستی کرتا تھا تاج المآثر میں لکھا ہے:

''توقیر واحترام علماء دین کہ ورثہ انبیاء خزینہء علوم شریعت وحقیقت اند و بہ شرف قربت ومزیت درجہء اختصاص یافتہ واجب ومتعین دانست واعزاز واکرام ایشان بروفق کتاب وسنت مقدمہء بختیاری وعمدہء جہانداری شناخت۔'' (بزم مملوکیہ ۲۸)

قطب الدین ایبک بہت ہی فیاض بادشاہ تھا وہ انعام واکرام میں لاکھوں روپیہ تقسیم کر دیتا تھا اسکی یہ زر پاشی صرف اہل دربار تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ عام تھی، اسی لئے وہ ملک بخش کے نام سے مشہور ہوا۔ شعراء وفضلاء کے دامن بھی اسکی فیاضیوں سے بھرتے رہتے تھے۔ اسی عہد کے ایک مشہور شاعر مولانا بہاءالدین اوشی ہیں۔ یہ ایران سے ہندوستان آئے تھے اور قطب الدین کے دربار سے وابستہ ہو گئے اسی لئے قطب الدین کی فیاضی کی داد اپنے اشعار میں دی ہے جسکے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ای قطب آسماں کہ زسہم وز باس تو   دروز رزم رستم گہر بار بہ شکند
از شرم فیض قلزم موآج کت تو   در وقت بزم بحر گہر بار بہ شکند
میر ہر کہ بوئے خلق تو روزی گزر کند   او آرزوئے نافہء تاتار بہ شکند
ناہید گر نگوید مدح تو در نوا   رخم اش بوقت زخم برادر تار بہ شکند

بہاءالدین کے علاوہ دربار میں جمال الدین اور حمید الدین بھی فارسی کے مشہور ومعروف شاعر تھے۔

حمید الدین اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی مہارت رکھتا تھا یہ قطب الدین کے دربار کا تیسرا پروردہ شاعر تھا عوفی اسکے علمی فضائل اور شاعرانہ کمال کا بہت مداح تھا، اسکے متعلق لکھتا ہے:

''رسالت ومنشآت اودریں بلادشہورست وبرزباں فضلاء مزکور۔'' (بزم مملوکیہ ۱۴۷)

تاج مآثر اس زمانے کی مشہور ومعروف تاریخ ہے جو قطب الدین ایبک کی خواہش پر لکھی گئی تھی اسکا مولف حسن نظامی نیشاپوری ہے یہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا اپنے ممدوح قطب الدین ایبک کی تعریف میں ایک قطعہ اس طرح کہتا ہے:

از تیغ او بجائے صلیب و کلیسا　　　در دار کفر مسجد ومحراب ومنبر است
آنجا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں　　　اکنون خروش نعرہ اللہ اکبر است

قطب الدین ایبک کی طرح ناصر الدین قباچہ کا دربار بھی وشعراء فضلاء کا گہوارہ تھا محمد عوفی جسکو اسکے دربار میں فضیلت حاصل ہوئی اپنے تذکرہ لباب الاباب میں لکھتا ہے:

''یہ دربار علماء وفضلاء سے پر ہے یہ کتاب ایسا آسمان ہے جسمیں ارباب کمال کے ستارے چمکتے ہیں یہ ایک ایسا بوستان ہے جہاں فضل کی کلیاں اور ہنر کے شگوفے کھلے ہوئے ہیں۔'' (بزم مملوکیہ ۱۴۷)

محمد عوفی کا ستارۂ اقبال قباچہ کے دربار ہی میں چمکا اس نے علماء فضلاء اور شعراء میں صرف دو چار کا ہی ذکر کیا ہے جن میں شمس الدین بلخی، فضلی ملتانی، ضیاء الدین سنجری، بحیثیت شاعر اور طبقات ناصری کے مولف مولانا منہاج الدین جورجانی کا نام بہت مشہور ہے۔ محمد عوفی شمس الدین بلخی کے شاعرانہ کمال اور ذاتی اوصاف کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

''وہ ایک ایسا جوان ہے جسکی نظیر چرخ پیر نے نہیں دیکھی ہے اور چکر لگانے والے آسمان نے اس جیسا جامع صفات کسی اور کو نہیں پایا۔'' ۱۳۶

عوفی رقم طراز ہے کہ ''وہ شاعری میں انوری کا ہم پلہ تھا۔'' (بزم مملوکیہ ۱۶۶)

فضل ملتانی اور ضیاء الدین سنجری قادر الکلام شاعر تھے عوفی نے اسے فخر شعراء لکھا ہے۔ اسی عہد میں سندھ کی مشہور تاریخ چچنامہ کا فارسی ترجمہ محمد بن علی نے کیا اور وزیر عین الملک کے نام سے معنون کیا۔ التمش کے زمانہ میں بھی زر پاشی فیاضی اور شعراء کی سرپرستی کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ابونصر ناصری، امیر روحانی، اور تاج الدین اس عہد کے ممتاز شعراء تھے تاج الدین کا قد چھوٹا ہونے کے سبب اسے عام طور سے تاج الدین ریزہ کہتے تھے اور اسی نام سے وہ ادبی دنیا میں مشہور ومعروف ہوا۔ تاج الدین کی صحیح پیدائش کا تو پتہ نہیں مگر یہ ثابت ہے وہ ہندی نژاد تھا وہ ایک قصیدہ میں خود کہتا ہے:

مولد ومنشاء ببیں در خاک ہندوستاں مرا　　　نظم نثرم بیں کہ از آب خراسان آمدہ

ریزہ کے قصیدہ میں بہت ہی سلاست اور شگفتگی پائی جاتی ہے اسکی طرز ادا میں روانی و برجستگی ہے آورد کا پتہ نہیں چلتا ہے اسکی شاعری تکلفات سے پاک ہے۔

شہاب الدین مہرہ امیر خسرو کے استاد تھے۔ امیر خسرو نے انہیں امام العلماء وفضلاء کے لقب سے مخاطب کرتے تھے اور انکے کلام کو دیوانہ وار سنتے تھے۔ سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے بعد رضیہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوئی وہ ہندوستان کی پہلی حکمراں خاطون تھی اسمیں حکمرانی کے تمام اوصاف موجود تھے طبقات ناصری میں ہے کہ:

''بادشاہ بزرگ وعاقل وعادل کریم وعالم نواز وعدل گستر ورعیت پرور ولشکر کش بود۔''

لیکن انہوں نے اپنی تاریخ میں رضیہ کی علم نوازی اور علم پروری کی کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے۔'' (بزم مملوکیہ ۲۱۵)

التمش کا سب سے چھوٹا لڑکا ناصر الدین محمود بھی بہت علم دوست اور معارف پرور تھا اس کے عہد کے بہے مشہور عالم مولانا منہاج سے اسکی بڑی گرویدگی تھی انکے علاوہ اس عہد کے مشہور عالم وفاضل کے نام یہ ہیں:

شیخ عماد الدین، قاضی جلال الدین، قاضی شمس الدین، حضرت جمال الدین اور مولانا سید قطب الدین وغیرہ تھے۔ درباری شعراء میں مولانا منہاج الدین اور عمید الدین سنامی تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منہاج الدین شاعر سے زیادہ عالم واعظ اور مورخ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن عمید سنائی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے۔

اسکے بعد غیاث الدین بلبن دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ ایک لائق حکمراں ہونے کے ساتھ ساتھ عالم و فاضل بھی تھا اور علماء کی بہت ہی قدر کرتا تھا اسکے زمانے کے تمام جید عالم اسکے دربار میں موجود تھے بلبن کو علماء ومشائخ سے کچھ ایسی دلچسپی رہی کہ وہ شعراء کی طرف مائل نہ ہوسکا درباری روایت کے مطابق شعراء اسکے سامنے اکثر قصائد پڑھتے اور چلے جاتے وہ ذوق شعری سے کچھ ایسا عاری تھا کہ علماء کی طرح شعراء اسکے دربار میں رسوخ حاصل نہ کر سکے اسکے دربار میں شمس دبیر، قاضی اثیر، امیر خسرو اور حسن سجزی کی شاعری میں چار چاند لگے۔ بلبن کے بیٹوں کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی ان شعراء نے انہیں کی شان میں قصیدے کہے اور اپنے دامن لعل و گہر سے بھر لئے ان شہزادوں کی مجلسیں علماء فضلاء اور شعراء سے بھری رہتی تھیں اور اسمیں برابر شاہنامہ، دیوان سنائی، دیوان خاقانی اور خمسہ نظامی پڑھے جاتے تھے اور ان پر عالمانہ بحث ہوتی تھی ارباب شوق شہزادوں کے شعر فہمی کے بیحد معترف تھے۔ امیر خسرو اور حسن سجزی کے علاوہ ایک ممتاز شاعر شمس دبیر تھے جنکا اصل نام شمس الدین تھا دہلی کے مملوک سلاطین کے دربار سے وابستہ ہوئے تو سکریٹری کے فرائض انجام دینے لگے اسی لئے انکے نام کے ساتھ دبیر منسلک ہوگیا۔

امیر خسرو شمس دبیر کے سخن سنجی اور سخن فہمی کے برابر معترف رہے مولانا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ:

''شاعر شمس دبیر کے فضائل وکمالت بیان سے باہر، اور تعریف وتوصیف سے مستغنی ہیں انہوں نے یہ بھی لکھا

ہے کہ امیر خسرو اپنے اشعار کے اچھے ہونے کا معیار انکی پسند پر رکھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔'' (بزم مملوکیہ ۳۱۵)

سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے اپنی اس کتاب بزم مملوکیہ میں مملوک بادشاہوں کی علم دوستی اور معارف پروری کے ساتھ ساتھ انکے دربار سے منسلک تمام ادباء علماء فضلاء اور شعراء پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے یہ تصنیف اپنی نوعیت کی واحد تصنیف ہے۔

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں: سید صباح الدین صاحب نے اس کتاب کی ابتداء میں امیر خسرو پر ایک وسیط مقدمہ لکھا ہے جس میں انکے احوال و آثار کے ساتھ ساتھ وہ تاثرات بھی جمع کئے ہیں جو انکے وطن دوستی وطن نوازی اور وطن پروری پر مشتمل ہیں اس سے اس دور کا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے مقدمے کے بعد امیر خسرو کی مثنویاں سے ان اشعار کو اخز کیا ہے جو ہندوستان کے متعلق ہیں یہ کتاب انیس سو چھیاچھٹھ (۱۹۶۶ء) میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔

امیر خسرو کی مثنویاں ایک تاریخی لٹریچر ثابت ہورہی ہیں جس میں قدیم ہندوستان اپنی تمام تر رعنائی و برنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے وہ اپنی مثنوی قران السعدین میں دہلی اور دہلی کے عوام کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔ دہلی کے دین و انصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہے یہ عدن کی جنت ہے یہ اپنی صفات اور خصوصیات کی بناء پر باغ ارم کی طرح ہے اس بوستان کا قصہ سن کر مکہ بھی ہندوستان کا طواف کرنے لگا ہیا سی طرح امیر خسرو نے اپنی مثنویوں اور دیوانوں میں ہندوستان کی رسم و رواج اور یہاں کی اشیاء کا صرف ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ دیگر ممالک سے انکا موازنہ کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان ہر اعتبار سے دوسرے ممالک سے بہتر و برتر ہے۔ امیر خسرو اپنی مثنوی قران السعدین میں دہلی کے باشندوں، عمارات، لوگوں اور بازاروں کی تعریف اشعار کہے ہیں۔

سید صباح الدین عبد الرحمان کی تمام تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بہترین مورخ، اعلیٰ نقاد، منجھے ہوئے سخن فہم اور یکتا نثر نویس تھے یہی وجہ ہے ان کی تمام تصانیف کئی زبانوں میں ترجمہ ہوکر اپنی اہمیت و افادیت کا لوہا منوا چکی ہیں اور وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی فارسی تاریخ و تحقیق کی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر عزیر عباس
صدر شعبہ اردو و فارسی، گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر
ڈاکٹر محمد الطاف بٹ
شعبہ اردو و فارسی، گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر

کشمیر میں عصر حاضر کا فارسی شاعر: انیسؔ کاظمی

چکیدہ: خطہ بے نظیر یعنی کشمیر ہمیشہ سے اہل دنیا کے لئے سیر و سیاحت کا مرکز رہا ہے، ہند میں فارسی زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس خطہ میں فارسی کو خوب فروغ حاصل ہوا سبک ہندی کے تقریباً تمام شعراء کے کلام میں اس خطہ کے اوصاف پر اشعار مل جاتے ہیں، لہٰذا آج بھی اس خطے میں فارسی کے شاعروں کی تعداد خاصی ہے ایسے ہی شعراء میں ایک شاعر انیس کاظمی ہیں جن کا خاندانی تعلق ایران کے اردبیلی خاندان سے ملتا ہے۔ یہ خاندان کشمیر میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے مشہور رہا ہے، انیس کاظمی فارسی کے کثیر التصانیف مصنف بھی ہیں، شاعری میں انہوں نے مثنوی، غزل، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، قطعہ نیز تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی اور خوب کی ان کے اشعار عارفانہ افکار سے پر نظر آتے ہیں۔

کلیدی الفاظ: انیس کاظمی، کشمیر، فارسی، مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، شعر

بیسویں صدی کا آغاز کشمیر میں فارسی زبان و ادب کے لئے شکست و ریخت کا زمانہ ثابت ہوا، جس کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دوران حکومت [۱۸۸۵ تا ۱۹۲۵] فارسی زبان کی جگہ اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ دوسرا یہ کہ سیاسی اُتار چڑھاؤ اور حکمرانوں کی اس زبان سے عدم توجہی کے نتیجے میں فارسی مفکرین کی توجہ کا مرکز نہ سکی۔ تیسرا یہ کہ جہاں آج سے سوا سو سال پہلے کشمیر میں فارسی زبان و ادب اور شاعری کا چرچا ہر خاص و عام میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ وہیں آج اردو اور انگریزی زبان کا بول بالا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے یہی وہ زبان ہے جو کشمیر میں ورود اسلام سے لیکر انیسویں صدی کے تقریباً آٹھویں دھائی تک یہاں کی سرکاری اور ادبی زبان بن کر پھلتی پھولتی رہی۔ اس طرح سے یہ زبان یہاں کے ادبی، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی اُفق پر چھائی رہی۔ نتیجتاً بیسویں صدی

میں مختلف نشیب وفراز اور فارسی زبان کے تنزلی کے باوجود اس کا سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔

جن عظیم ادبی شخصیتوں نے کشمیر میں فارسی زبان کا وراثتی دامن نہیں چھوڑا ہے ان میں مولانا سید مبارک شاہ فطرتؔ، سید شمس الدین اندرابی غمگینؔ، حکیم غلام الدین سائقؔ، سید عبدالجبار خاموشؔ کریری، میر غلام رسول نازکیؔ، مولانا شمس الدین حیرتؔ کاملی، حکیم علی جلال الدین میثمؔ، پروفیسر مرغوب بانہالیؔ، پروفیسر شمس الدین احمد، پروفیسر محمد شاد، میرک شاہ کاندہمی اور حکیم سید محمد انیسؔ کاظمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

متزکرہ بالا شعراء نے نہ صرف فارسی زبان کی شاعری میں جدید موضوعات کو بڑھاوا دیا ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے اسلاف کی طرح عارفانہ، اخلاقی اور صوفیانہ مضامین کو بھی موضوع شاعری بنا کر علم اخلاق اور علم عرفان کی خوب آبیاری کی ہیں۔ اور انہی جدید شعراء میں ہمارے عارف شاعر حکیم سید محمد انیسؔ کاظمی ہیں جن سے متعلق یہ مقالہ ہے۔

سید محمد انیسؔ کاظمی کی ولادت یوم جمعہ ۱۳۵۸ھ بمطابق ۱۹۴۰ء میں چوندہ پورہ بڑگام میں ہوئی۔[۱] آپ کے پدر بزرگوار سید مصطفیٰ بن سید علی تھے۔ جو اپنے زمانے کے جیّد عالم، شاعر اور فارسی زبان کے استاد تھے۔ ان کا خاندانی سلسلۂ نسب ایران کے اردبیلی خاندان سے ملتا ہے۔ کشمیر میں یہ خاندان کئی پیڑھیوں سے اسلام کی ترویج سے وابسطہ رہا ہے۔ کشمیر میں ان کے جداعلیٰ علامہ سید حسین باغبان پوری تھے۔

سید محمد انیسؔ کاظمی نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں ہی حاصل کی۔ سن صغر میں ہی اپنے چچا سید حسین صالح اور والد محترم سید مصطفیٰ سے قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ مزید دینی تعلیم اور روحانی فیض حاصل کرنے کے غرض سے چند مقامی اساتذہ سے بھی درس لیتے رہے۔ پھر مدرسہ 'باب العلم' بڈگام کا رخ کیا۔ اس مدرسہ میں موصوف نے مولوی عالم کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مرگورنمنٹ اورینٹل کالج باغ دلاور خان میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۲ء میں جموں وکشمیر یونیورسٹی کے ذریعے دوبارہ مولوی عالم کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ اس کے بعد مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔ مولانا غلام محمد وفائیؔ کی رہنمائی میں منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ پھر اسی استاد کے مشورے سے جامع اُردو علی گڑھ سے ادیب ماہر کی سند حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف مقامی وغیر مقامی دسگاہوں میں بحیثیت استاد درس دیتے رہے۔

انیس کاظمی نہ صرف عصر حاضر کے بلند پایہ عارف شاعر ہیں۔ بلکہ جیّد عالم، مصنّف، معلم، مترجم، مورخ اور اعلیٰ پایہ کے ادبی شخصیت بھی ہیں۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان سے باہر بلند مرتبہ علماً [۲] سے بھی علوم ظاہری وباطنی حاصل کیا ہے۔

عصر حاضر کے عارف شاعر نے تقریباً چوبیس کتابیں اردو، کشمیری اور فارسی زبان میں لکھی ہیں۔ جن میں

''سفینتہ النجات''رسالہ شریفہ مناسکِ حج ترجمہ از مفتاح العلیین''مراتہ العارفین ترجمہ مصباح النّاسکین ومشکواتہ الحاج والمعتمرین''،''انیس العروض''کلیات میرزا ابوالقاسم''، تبرکات حکیم عبداللہ''،''استغاثہ حسینی''،''رشحات کوثر''۳ اور تاریخی کتاب''چاند میری زمین پھول میرا وطن''جو کشمیر کی مختصر تاریخ ہے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک انیسؔ کاظمی کی شعروشاعری کی بات ہے وہ انہوں نے وراثت میں پائی۔ان کا بچپن سے ہی بلعموم کشمیری واُردو شاعری اور بلخصوص فارسی شاعری کی طرف ذاتی رجحان رہا ہے۔اپنے اس شوق کو نکھارلانے کی خاطر فارسی زبان وادبیات کی شاہکار کتابیں جیسے''گلستان و بوستان''از سعدی،''پنج گنج''نظامیؔ،''شاہنامہ فردوسی''اور مثنوی مولانا جلال الدین رومیؔ''، کا بغور مطالعہ کیا۔اس کے ساتھ ساتھ شاعری کے دقیق فن 'علم عروض' کی فرہ گیری استاد مولانا جلال الدین میثم سے حاص کی۔اسطرح سے انہوں نے فارسی شاعری میں خاصی دسترس حاصل کی۔مختلف انواع شعر جیسے مثنوی، قطعہ، مرثیہ،قصیدہ، رباعی اور نعت ومنقبت میں طبع آزمائی کی ہے۔موصوف کا بیشتر فارسی کلام عشق الٰہی ،محبت رسول کریمؐ اور مدحتِ اہلبیت اطہارؑ سے سرشار ہے۔ان کے کلام کا مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف علم وعرفان اور حقیقی شراب میں اس قدر مستغرق ہیں کہ ان کی زبان سے عارفانہ اور زاہدانہ اشعار نکلتے ہیں۔ ۴

بدہ ساقی شراب ارغوانی		کہ شاید باز آید نو جوانی
عجب بادہ ولا ایں دم کنم نوش		ز مستی جملہ را سازم فراموش

موصوف کی فارسی شاعری کے قادر الکلامی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن موصوف نے رسالہ'الارشاد' میں 'معجزہ آلِ نبیؐ' کے عنوان سے ایک نثری داستان پڑھی۔وہ انہیں اِس قدر پسند آئی کہ چندروز کے اندر ہی اس داستان کو منظوم فارسی کا جامہ پہنایا۔چند اشعار پیش خدمت ہیں۔۵

روایت می کند راوی سخنور		بمسجد رفت روزی شاہِ حیدرؑ
یکا یک سائلے آمد صدا کرد		بشاہ اسخیا ہچوں ندا کرد
کہ در جود وسخا تو شہرہ داری		ز فیاضی و احسان بہرہ داری
و این پسرک کہ تو بر دوش داری		عنایت کُن مرا در راہِ باری
حسنؑ بر دوش مولا بود آن دم		حوالہ کرد سائل را دران دم
گدا گفت فرزند دیگر حسینؑت		تفضّل کن بمن از نور عینت
علیؑ گفتا کہ اے سائل ادب کن		حسینؑم را تو از مادر طلب کن
کہ ہم نفس و انیس است خوب با او		چو دارد سنبل بستان با بو

شنیدہ چون گداگر این سخن را   بدست خود گرفتہ شہ حسنؑ را
و آمد بر درِ زھرائیؑ اطھر   چنیں آواز در را دہ گدا گر
ایا اے دخترِ خیر الانامیؐ   کہ در جود و سخاہم نیک نامی
علّیم مرحمت فرمود شبر   دلم خرم نمود نفس پیمبر
سوالت میکنم از بہر شبیرؑ   عطایم کن شود بختم چو اکسیر
بدو فرمود زہراؐ پاک سیرت   رہِ مولا فدا جانم و دولت
مہ دہ تو واسطہ حق خدا را   حسینمؑ حاضر است در راہِ مولا
حسینؑ بر در چو آمد نور دیدہ   برونِ در برادر را چو دیدہ
بدو گفتا بیا اندر برادر   چرا ایستادہ ہستی بر سرِ در
بدست سائلم مالِ خدایم   نمی آیم درون حق را فدایم

انیسؔ کاظمی نے فارسی مرثیہ گوئی کی صنف میں بھی دسترس حاصل کی ہے۔شہداء کربلا کے مصائب کے علاوہ اپنے مرثیوں میں شخصی مرثیوں کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے استاد علی جلال الدین غازی میثمؔ کی وفات پر کہے گئے پُر درد مرثیہ کے چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ ۶

غازیِ میدانِ حکمت شہسوار شعر فن   باغبانِ گلشن دانشوران شیخ و کبیر
بود او استادِ استادان ابوطلّابِ دین   سعدیِ دوران انیسِؔ عصرِ ما ثانی دبیر
باز وصلش از خرد جستم کہ بودم مضطرب   گشت بے سر دین و جامع، گفت خورشید منیر

۴۱۳ : ۷ ـ ۱۴۲۰

اس کے علاوہ موصوف نے قصیدہ کی صنفِ سخن میں بھی کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔اکثر شاعروں نے اپنے قصیدوں میں بادشاہوں اور امیروں کی مدح سرای کی ہے۔اس کے برعکس انیسؔ کاظمی نے اپنی زبان کسی بادشاہ کی مدح سرای سے آلودہ نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے اپنے قصاید میں رسولِ کریمؐ اور آئمہ طاہرینؑ کی مدح گوئی کی ہے۔انکی قصیدہ گوئی ہو یا مثنوی یا پھر رباعی وغیرہ ہو، سب میں عشق وعرفان اور محبت رسولِ مقبولؐ اور آل رسولؑ سے محبت کی دعوت ملتی ہیں۔موصوف کے تمام اصناف سخن میں عارفانہ مطالب کے ساتھ ساتھ پند ونصائح اور دنیائی ناپیدار سے بیزار ہونے کا درس بھی ملتا ہے۔جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے موصوف کا شمار کشمیر میں عصر حاضر کے اعلیٰ پایہ عالم اور ذاکرین کرام میں ہوتا ہیں۔ان کی محفل میں آج بھی سیکنڑوں کی تعداد میں افراد بغیر مذہب وملت شرکت کرتے ہیں۔اور روحانی فیض بھی

حاصل کرتے ہیں۔تشنگانِ علم ومعرفت موصوف سے خاص طور پر علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ روحانی فیض بھی حاصل کرتے ہیں۔کشمیر کے موسوی سادات کے قبرستان میں بلند پایہ کے علماء اور فقہا دفن ہیں۔موصوف شاعر کے پیرِ کامل آقا سید یوسف علیہ رحمہ بھی اسی قبرستان میں دفن ہیں۔شاعر نے اس کی توصیف میں ''باغ یوسف'' کے عنوان سے ایک نظم کہی جس کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ ؎

روضۂ رضوان منزل خلد یوسف مومنان — شرح من ایمان من ایقان من پیمان من
سائلے پرسید از من کیفت از این مقام — تا کہ باشد یادگارے در دل دبستان من
گر نخواہی باز گوئ بے سرالمش اساس — 'گلِ راہ باغ یوسف' سرُ مہ عرفان من

۱۴۱۴ھ

مؤلفِ تاریخ شیعان کشمیر انیسؔ کاظمی صاحب کی شاعری کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

''استاد انیس کاظمی صاحب جو ایک عظیم پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے بدیل ادیب وشاعر بھی ہیں۔۔۔'' ۸؎

سید محمد انیس کاظمی کو جس صنف سخن نے عصر حاضر میں قبولیت کا تاج بخشا وہ انکی عارفانہ، نعتیہ اور منقبت ہے۔انکا شمار کشمیر کے ان صوفی شعرأ میں ہوتا ہے جو اپنے عارفانہ اور زاہدانہ مزاج کی بدولت فارسی شاعری کے میدان میں گمنامی کے عالم میں ہیں۔جسکی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ موصوف اکثر وبیشتر دینی مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔اسلئے ادبی حلقہ میں ان کی زیادہ تر پہچان ایک عالم دین کی حیثیت سے ہے۔جبکہ موصوف فارسی زبان کے اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں۔ان کا بعض کلام ماہ نامہ ''الارشاد'' میں شائع ہوا ہے اور اکثر فارسی کلام طباعت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوا ۔بلکہ قلمی نسخہ جات میں موصوف کے گھر میں ڈھیر پڑے ہیں۔جسکی جمع آوری اور طباعت عاشقان رسولؐ اور تشنگان علم و عرفان کی نظر میں بہت اہم ہے۔آپ کے کلام میں فارسی شاعری کا بیش بہا خزانہ پنہاں ہے۔

یہاں پر یہ بات واضح کی جاتی ہے کہ ان سطور کے لکھنے تک حکیم سید محمد انیسؔ کاظمی بقید حیات ہیں اور پیری اور بزرگی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔اس کے باوجود آج بھی فہرست کے لمحات میں اپنے عارفانہ اور زاہدانہ جزبات اور احساسات کو فارسی شاعری کا لبادہ پہناتے رہتے ہیں۔

کتابیات وحواشی:۔

۱۔''سفینۃ النجات'' از سید محمد انیسؔ کاظمی، سال اشاعت ۲۰۱۳ء، مطبع میر پریس محلّہ سید افضل جڈی بل سرینگر، ص۔۳۹۰

۲۔کاشر زبان تہ ءآدبک تواریخ، مولفہ ناجی منوّر، شفیع شوق، طباعت سال ۲۰۱۴ء، ناشر علی محمد اینڈ سنز، سرینگر۔ص ا۔۲

۳۔حاشیہ۔مسلم ممالک کے علماء کے ساتھ آج بھی خط وکتابت جاری ہے اور راقم نے اس ضمن میں بہت سارے خطوط موصوف

کے ذاتی کتب خانہ واقع چندہ پورہ بڈگام میں دیکھے ہیں اور تمام خطوط اصلی صورت میں محفوظ ہیں۔
۳ حاشیہ۔ یہ کتاب موصوف نے خاندانی شجرہ نسب پر لکھی ہے۔ اور اس کتاب میں کاظمی صاحب نے مستند کتابوں کے حوالہ جات بھی دئے ہیں۔ یہ مطبع شدہ کتاب ہے۔
۴۔ قلمی نسخہ، از سید محمد انیس کاظمی۔
۵۔ قلمی نسخہ از انیس کاظمی ص ۱۔۲
۶۔ نسخہ خطی از انیس کاظمی۔
۷۔ قلمی نسخہ، از انیس کاظمی۔
۸۔ ''تاریخ شیعان کشمیر'' مؤلف غلام محمد متوگلزار، پہلا ایڈیشن ۲۰۱۰ء، ناشر: ادارہ امام زمانؑ، محلّہ مقدم پورہ شالنہ سرینگر۔ ص ۶۲۲۔
متذکرہ بالا کتابوں کے علاوہ راقم نے چند ماہنامہ 'الارشاد' باب العلم بڈگام سے بھی استفادہ کیا ہے۔

☆☆☆

میراث خطی

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی
شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

مثنوی ''قران السعدین'' کی شرح کے ایک خطی نسخہ کا تعارف

چکیدہ:۔ طوطی ہند یعنی امیر خسرو کی شہرت کو آفاقیت ان کے زمانہ میں ہی حاصل ہوگئی، انکی منظوم و منثور تصانیف، حکومت وقت میں بہترین حصہ داری، سلطان المشائخ کی مریدی اور صوفیانہ رنگ و آہنگ و افکار کے ذریعہ وہ لوگوں کی علمی اور عملی زندگی میں راہنما بن گئے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کی لاتعداد شرحیں لکھی گئیں۔ خسرو کی مثنوی ''قران السعدین'' کے ایک شارح حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کے فرزند حضرت مولانا نور الحق مشرقی بھی ہیں، اس بہترین شرح کی طباعت ابھی تک عمل میں نہ آسکی مقالہ ہذا میں اس شرح کے قلمی نسخہ (جو کہ ندوۃ العلماء کی لائبریری میں موجود ہے) کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

کلیدی الفاظ:۔ قران السعدین، امیر خسرو، مشرقی، تصانیف، مثنوی، نظم

من کہ دریں آئینۂ پر خیال — بکر سخن را بنمودم جمال
کس کہ شناسد کہ چہ خوں خوردہ ام — کیں گہر از حقہ بر آوردہ ام
ساختہ ام ایں ہمہ لعل و گہر — ازخوئے پیشانی و خون جگر
تا نہم از فکرت پنہانیش — گہ بہ جگر گاہ بہ پیشانیش
در تہ خرقش ہمہ باریکی ست — آب خضر در دل تاریکی ست
نقطۂ ہر حرف بزیب ترین — مردمک چشم معانی یقین
اوج معانی نہ بہ مقدار طبع — بلک گزشتہ ز سموات سبع(۱)

مثنوی ''قران السعدین'' کا شمار ''طوطی ہند'' حضرت امیر خسرو کی اہم مثنویوں میں ہوتا ہے، یہ مثنوی انہوں نے

سلطان معزالدین کیقباد (مدت حکومت ۱۲۹۰ء۔۱۲۸۷ء) کی فرمائش پر نظم کی، اس مثنوی کو امیر خسرو نے چھ (۶) مہینے کی محنت مشاقہ کے بعد رمضان المبارک ۶۸۸ھ میں مکمل کیا اور 'قران السعدین' کا عنوان دے کر کیقباد کو پیش کیا، اس مثنوی میں اشعار کی کل تعداد تین ہزار نو سو چوالیس (۳۹۴۴) ہے۔

اس مثنوی میں خسرو نے سلطان معزالدین کیقباد اور اس کے باپ سلطان ناصرالدین کی ناچاقی اور ناراضگی کے بعد ملاقات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی باضابطہ طور پر خسرو کی پہلی مثنوی ہے جسے نظم کرنے سے پہلے اس صنف مثنوی میں طبع آزمائی کو نہایت مشکل کام سمجھتے تھے۔

در ہوس مثنویت در دل ہست — حل کنم این بر تو کہ بس مشکل است
بگذر ازاین خانہ کہ جائے تو نیست — وین رہ باریک بہ پائے تو نیست (۲)

لیکن اس کی تکمیل کے بعد ان کو نہایت فخر وانبساط کا احساس ہوا اور ان کے دلی جذبات ان اشعار کی صورت میں ظاہر ہوئے

دید چون این مثنوی بیش را — تیر قلم کرد سر خویش را
ہر یک ازین بیت کہ جنت وش است — شد خوشی دل کہ چو جنت خوش است (۳)

خسرو کے جادو نگار قلم اور ایجاد پسند طبیعت نے ایک خشک موضوع کو جس طرح دلچسپ، رنگین اور متنوع بنا دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے مختصراً یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ وصف نگاری، جودت طبع، تمثیل نگاری، الفاظ کے انتخاب اور ان کے مناسب استعمال کے سلیقہ نے حقیقتاً اس مثنوی کو لافانی بنا دیا اور آج اپنی تخلیق کے ساڑھے سات سو (۷۵۰) برس گذر جانے کے بعد بھی اس کی شہرت ومقبولیت برقرار ہے۔

اس شاہکار مثنوی کی شرح گیارہویں صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بیٹے شیخ نورالحق متخلص بہ مشرقی دہلوی نے تحریر کیا۔

شیخ نورالحق متخلص بہ مشرقی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ۔۹۵۸ھ) کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی ولادت ۹۸۳ھ میں ہوئی اور تعلیم وتربیت تمام وکمال پدر محترم سے حاصل کی حضرت محدثؒ ان کو اپنا وجود ثانی کہتے تھے اور ان کو اپنا جانشین وخلیفہ نامزد کیا تھا۔ ذوق شاعری ان کو ورثہ میں ملا تھا۔

مشرقی کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۔شرح شمائل ترمذی۔ (مخطوطہ رام پور رضا لائبریری)
۔تفسیر سورۂ فاتحہ، (مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

۔حاشیہ علی شرح جامی،
۔شرح عضدی، شرح مطالعہ شرح ہدایہ،
۔شرح قران السعدین
۔رسالہ در بیان رویا
۔محی القلوب
۔زبدۃ التواریخ

ان کے سلسلہ میں شیخ عبدالحق محدثؒ کی رائے سے ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

''وجود فرزند مسعود نور دیدۂ دانش و بینش نور الحق الملقب بمشرقی است کہ شروق نیر فضل و کمال وے در ہر دو طریقۂ دانشوری و سخنوری با وسط السماء استوا و اعتدال نزدیک بسمت الراس رسیدہ است، یقین منست کہ اگر وے توجہ بر گمارد و گر طریقۂ شعراء زمانہ شب و روز بمشق سخن و فکر شعر روئے آرد خمسۂ نظامی و خسرو را تتبع تواند کرد لیکن توجہ و اشتغال وے بجانب علم و صلاح و نفس الامر غالب آمدہ نمی گذارد کہ بطرف شعر و طریقۂ شعر روئے آرد'' (۴)

مشرقی بھی اپنے والد حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ والد و مرشد کی شان میں کہے گئے مندرجہ ذیل اشعار سے ان کی عقیدت و محبت کا اندازہ ہوتا ہے:

جبۂ او مطلع انوار حق — سینۂ او مخزن اسرار حق
کلک وے ابر ابریست وے درنشاں — دانش او بحر وے بیکران
چاردۂ علم از قلمش منکشف — ہم بصفات ملکی متصف
معرفتش از نطق متینش بدید — نور ولایت ز جبینش پدید
واقف سری ہمہ باطول و عرض — کاشف آیات سماوات و ارض
صحبتش اکسیر ولایت اثر — صورت او نخل ہدایت شمر
دین کہ گنجینہ بر معنی پرم — رہ بسوی فیض ازل می برم
پر تواز معنی والای اوست — شمۂ از باطن دریای اوست
فخر من این بسکہ بچندین شرف — نیک ندارد زمن این خلف
باد خدایا (کذا) کمال کرم — سایہ فشاں تا بہ ابد بر سرم (۵)

مذکورہ بالا شرح کے خطی نسخے پرٹش میوزیم اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کتب خانہ میں ملتے ہیں۔ (۶) سطور

ذیل میں شبلی کتب خانہ ندوۃ العلماء میں محفوظ اس شرح کے خطی نسخہ کا تعارف پیش کرنے کی طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے۔

عنوان: شرح قران السعدین

کال نمبر: ادب فارسی شمارہ (۵۰)

شارح: شیخ نورالحق دہلوی متخلص بہ مشرقی

زبان: فارسی

کاغذ: دستی

خط: شکستہ نستعلیق

اوراق: ۱۰۲ (ایک سو دو)

سطر: ۱۳

اندازہ: ۱۳x۱۷ سینٹی میٹر

توضیحات: نسخہ کرم خوردہ ہے، چند اوراق کی ترتیب غلط ہے۔

آغاز: خطبۂ کبریای جلال بہ بادشاہے را کہ بادشاہی اورا آغاز و بدایت نیست و ملک اورا انجام ونہایت۔ آفریدگاری کہ بیک امر کن پردگیان عدم راخلعت وجود بخشد (۷)

انجام: اگر کسے دزدیدہ ام و برداشتہ ام عیب مکن (۸)

ترقیمہ: تمت تمام شد کا این نظام شد ہذا النسخہ شرح قران السعدین من تصنیف شیخ محمد نوراللہ المدعو بہ نورالحق دیہلوی بروز یکشنبہ دروقت نماز عصر این کتاب سید میر احسان علی بندہ کسے دعوی کند باطل گردد (۹)

لیکن اس ترقیمہ سے ماہ وسال ومقام وغیرہ کی صراحت نہیں ہوتی ہے۔

سال تالیف: شیخ نورالحق نے شرح کے سال تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل قطعہ کہا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ''شرح قران السعدین'' اس کا تاریخی نام ہے۔

شکر للہ کہ با نجام رسید — شرح ابیات قران السعدین
مشرقی از پے تاریخ نمام — برہ تعمیہ رفتی نہ بعین
چشم عیب از میان بردارند — می شود شرح قران السعدین (۱۰)

''شرح قران السعدین'' کے بحساب جمل ۱۰۸۴ عدد بنتے ہیں اس میں ''چشم عیب'' یعنی ع کے ستر عدد منہا کرنے پر ۱۰۱۴ برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا سنہ تالیف ۱۰۱۴ھ قرار دیا جاسکتا ہے۔

شیخ نورالحق نے اس شرح میں عام فہم اور سہل زبان اختیار کی ہے تاریخی واقعات کی شرح میں نہایت تفصیل سے کام لیا ہے جس سے تاریخ سے ان کی گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح نجوم، منطق اور فلسفہ وغیرہ دیگر علوم وفنون کی اصطلاحات کو بھی شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ لیکن انہوں نے غزلوں کو ہاتھ نہیں لگایا ہے جن کی مجموعی تعداد بیس (۲۰) سے زیادہ ہے اور زبان و بیان نیز دیگر خصوصیات کی بنا پر وہ خاصے کی چیز ہیں۔ خسروؔ کو بھی ان غزلوں کی خوبی کا احساس تھا تبھی تو انہوں نے کہا تھا:

ہر غزلے دشنۂ عشاق کش   پیش کہ بکشد زدروں پردہ پش

شارح نے جن مصادر کو شرح تحریر کرنے دوران پیش نظر رکھا ان میں سے بعض کے نام بھی تحریر کئے ہیں جن میں لغت فرس، مؤید الفضلا، آداب المفضلات اور کفایۃ المنجمین وغیرہ شامل ہیں۔

حمد وصلوٰۃ کے بعد لکھتے ہیں:

''کمترین بندگان نوراللہ مدعو بنورالحق ورقی چنداست در شرح معانی دخل الفاظ نامۂ والاقرآن السعدین منظومہ سلطان الشعراء، ملک الفضلاء، مخزن فنون سخندانی، بحر زخار جواہر معانی، دریای مواج لطافت ونکتہ دانی، شامل السباب صنایع وبدایع سخنوری، حاوی انواع عجایب وغرایب، فضیلت پرور، جامع کمالات صوری ومعنوی امیر خسروؔ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ و اسعہ کہ در لطافت معانی واشارات سایرار باب بیان راانگشت تحریر در دہان وسر تامل وتفکر در گریبان افگندہ است ہر داستان ازخزینہ ایست پرازز لال ضلالی وکیسہ ایست پراز جواہر آبدار عالی، فطرتان خرد پرور نیکوشناسد کہ چگونہ نکو برین الفاظ پردہ کشائی این عروسان حجلہ نشین وبرقہ براندازاین مہ جبینان خلوت گزین گشتہ۔''(۱۱)

قران السعدین کے سلسلہ میں ان کی مندرجہ ذیل تحریر علم نجوم سے ان کی گہری واقفیت پر دلالت کرتی ہے۔

''سعدین در اصطلاح منجمین نام دو کواکب سیار است کہ مشتری وزہرۂ اول راسعد اکبر گویند ثانی را سعد اصغر، قران بہ معنی اتصال است، در اصطلاح اہل تنجیم یکجا شدن دو کوکب از ماہ ومہر وخمسہ متحیرہ پنج کواکب است از کواکب سیارہ غیر آفتاب واین دو رانیّر (گویند) اول را اصغر وثانی را نیر اعظم واتصال نیرین اا جتماع واتصال یکی از خمسہ متحیرہ بہ شمس احتراق آن کواکب نامند ووجہ تسمیہ این نامہ بہ قران السعدین بہ ملاحظہ تشبیہ اجتماع معزالدین کیقباد بہ بدر خود کہ درین کتاب آن خواہند کرد بہ قران دو کواکب مذکوراست۔۔۔۔۔۔۔۔۔تقریر این معنی آنکہ از ان جہت نام این قران السعدین کردم کہ بہ سبب بلندی مرتبہ مشتری وزہرہ مقرون است یعنی چون در کمال مرتبہ بلاغت وفصاحت واقع شدہ در سعادت و نیکوی مثل قران السعدین سپہراست این معنی خالی از ترا کیب نیست اگرچہ ظاہر معنی اول است۔''(۱۲)

چند متفرق اشعار اوران کی شرح ملاحظہ ہو۔ جس سے ''خسرو شناسی'' کی نئی جہتیں روشناس ہوتی ہیں۔

رخش علل در رہش افگندہ سم علت و معلول درو ہر دو گم (۱۳)

''علل جمع علت است بہ معنی دلیل و معلول بمعنی مدلول رخش اسپ تیز و گویند نام اسپ رستم بود و رخش علل استعارت ات، سم افگندن کنایت از عجز و در ماندن است حاصل معنی آنکہ چوں دلیل در راہ معرفت حق بجای نرسیدہ پس مدلول کہ بہ وی ثابت شود و معلول از وی حاصل آید نیز کم و لاشی خواہند بود پس ہم علت کم است و ہم معلول بہ ایں ثباتی کہ کردہ شد باشد کہ اجزای عالم (را) علت و معلول یک دیگر دانند و در افعال الٰہی وسایط و اسباب (کذا) نمایند علت برای این تقدیر نیست آیندہ است تقریر این معنی آنکہ اسباب و سایط در افعال حق اثبات نمودن ضائع و بیکار است و بجای شہر شد زیرا کہ جمع اجزای حاکم آن را علت و معلول گویند در حشمت قدرت او نامحبوس و ناپیدا است چگونہ موقوف علت او تواند بود پس فاعل بی واسطہ ہمہ جا اوست'' (۱۴)

نعت رسول ﷺ پر مشتمل ایک شعر اس کی شرح ملاحظہ ہو:

گل کہ لباس خوشیس در برست از خوئی دیباچۂ پیغمبر است (۱۵)

''خوئی نام جامہ ایست لطیف ابریشمی سرخ رنگ و لباس خوئی استعاریست برای صورت گل سرخ یعنی گل این چنین مقرر لطیف و خوش رنگ افتادہ از آنست کہ اصل او از عرق پیشانی آنحضرتؐ است'' (۱۶)

آخر میں دو اشعار اوران کی شرح ملاحظہ ہو:

شاہ فلک چو بکمان دست برد تیرمہ اقلیم بر سرما سپرد

''مراد این جا از شاہ فلک آفتاب است بکمان دست برد بہ قوس در آمد و چوں آفتاب بہ برج قوس در آید زمستان بکمال باشد تیرمہ نام فارسیان است و آن مدت بودن آفتاب است در سرطان۔''

اطلس رنگین کہ خون آمدہ آتش ازو دود برون آمدہ

''یعنی اطلس کہ رنگ سرخ داشت چنان بود کہ آتشے بے دود آبی خالص بے برگی و نیز دود بمعنی گرم است و اصل اطلس ہم از گرم است۔''

مذکوہ مخطوطہ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دیگر دستیاب نسخوں کی مدد سے اس اہم شرح کا ایک تنقیدی متن مرتب ہونا چاہئے تا کہ ایک طرف تو علمی دنیا اس نادر و نایاب شرح سے واقف ہو سکے اور دوسری طرف عقیدت مندان و شیفتگان خسرؔو اس علمی تحفہ سے محظوظ ہو سکیں۔

مآخذ ومصادر

۱۔مثنوی قران السعدین، امیر خسرو، نولکشور پریس کانپور، جون ۱۸۷۳ء، ص ۱۷۹۔۱۷۸
۲۔ایضاً، ص ۱۸۸
۳۔ایضاً، ص ۱۷۹
۴۔رسالۂ وصیت قلمی، بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی از پروفیسر خلیق احمد نظامی
۵۔شرح قران السعدین قلمی ورق ۲، بہ و ورق ۳، الف
۶۔بحوالہ حیات شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی دہلوی از پروفیسر خلیق احمد نظامی
۷۔ورق ۱، الف
۸۔ورق ۱۰۲، الف
۹۔ورق ۱۰۲، الف
۱۰۔ورق ۳، ب
۱۱۔ورق ۲، الف
۱۲۔یعنی عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل
۱۳۔ورق ۴، ب
۱۴۔قران السعدین مطبوعہ ص ۳
۱۵۔ورق ۵، الف
۱۶۔قران السعدین مطبوعہ ص ۱۱

☆☆☆☆☆

مناظر حق
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دیوان فطرت کے اہم خطی نسخے

چکیدہ : مرزا معز الدین موسوی خان فطرت عہد عالمگیر کے نامور شعراء میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے صوبہ بہار اور صوبہ دکن میں بھی اپنی خدمات دی تھیں سبک ہندی کے بڑے شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے مگر ان کا دیوان ابھی تک مرتب ہو کر منظر عام پر نہ آ سکا، دیوان کے قلمی نسخے مختلف لائبریریوں مثلاً مولانا آزاد لائبریری، خدا بخش لائبریری، سالار جنگ میوزیم لائبریری، ایران کلچر ہائوس وغیرہ میں موجود ہیں دیوان کے علاوہ ایک مثنوی بھی بعنوان ''قصہ بنارس'' ملتی ہے۔

کلیدی الفاظ: سترہویں صدی، فارسی شاعری، سبک ہندی، موسوی خان فطرت، قلمی نسخے، کتب خانے، ہند

مرزا معز الدین محمد مخاطب بہ موسوی خان و متخلص بہ فطرتؔ کا شمار عہد عالمگیری کے نامور اور معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ انکا سلسلۂ نسب امام موسیٰ رضا علیہ الرحمتہ پر منتہی ہوتا ہے، اسلئے موسوی کہلاے(۱)۔ وہ قم کے ایک معزز سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے، میر محمد زمان مشہدی جیسے بڑے عالم کے نواسے اور مرزا فخر الدین کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدایی تعلیم قم اور مشہد میں مکمل کی۔ آزاد بلگرامی تزکرۂ سرو آزاد میں لکھتے ہیں:

''اوائیل کتب در وطن خود تحصیل کرد''(۲)

ابتدائے شباب میں کسی وجہ سے والد سے اختلافات ہو گے چنانچہ رنجیدہ ہو کر دار السلطنت اصفہان کا رخ کیا، جو اس وقت علم و ادب کا گہوارہ تھا اور وہاں اہل فضل و کمال کی محفلیں لگتی تھیں۔ اصفہان پہونچ کر انہوں نے آقا حسین خوانساری جیسے بڑے عالم کی شاگردی اختیار کر لی اور انکی سرپرستی میں علوم ادبی، منطق اور عقلیات و نقلیات میں کمال حاصل کیا۔

فطرتؔ کی سال پیدایش کے متعلق کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ انکی پیدایش ۱۰۵۰ھ میں قم میں ہوئی(۳)۔ فطرت نے اپنی تاریخ ولادت خود بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

افضل اہل زمانہ ۱۰۵۰ھ(۴)

۱۰۷۱ھ بمطابق ۱۶۶۲ء میں فطرت ہندوستان آئے اور دربار اورنگزیب کا رخ کیا۔ قابل اور ذہین ہونے کے ساتھ۔ ساتھ انکا نصیب بھی بہت بلند تھا اسلئے شہنشاہ اورنگزیب کی ان پر بہت عنایات ہویں اور شاہی دربار میں انکی بہت عزت افزائی اور خاطر خواہ پزیرائی ہوئی۔ بادشاہ اورنگزیب نے ان میں ذاتی اور نسبی جوہر دیکھ کر اپنے لطف وکرم سے مالا مال کیا اور شاہنواز صفوی کی بیٹی یعنی شہزادہ محمد اعظم کی خالہ سے انکی شادی ہوئی جس وجہ سے انکا درجہ اور بلند ہو گیا(۵)۔

فطرت کا شمار عہد عالمگیری کے بڑے شعراء اور علماء میں ہوتا ہے۔ چونکہ وہ نسلاً ایک ایرانی تھے اسلئے انہوں نے وہاں پر آقا حسین خوانساری، صایب تبریزی اور دیگر ادیبوں کی صحبت میں کسب فیض حاصل کیا تھا۔ ہندوستان میں انھیں فارسی شعر وادب کا مستند نقاد اور لوگ انھیں شاعری کا مسلم استاد تسلیم کرتے تھے۔ کسی شعر یا شاعر کے متعلق انکی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اگر چہ فطرت کا خود یہ کہنا تھا کہ اصلاً میں چمن علم کا بلبل ہوں شاعری کا نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

من مرغ خوش ترانۂ باغ فضیلتم
طبع مرا بہ زمزمۂ شاعری چہ کار؟

شاعری میں پہلے وہ فطرتؔ تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں حسب ونسب کی مناسبت سے موسوی تخلص اختیار کیا اس بنا پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ غزلیں جس میں فطرتؔ تخلص اختیار کیا گیا ہے وہ غالباً پہلے کی ہونگی اس کے علاوہ وہ بعض غزلوں میں وہ معزؔ بھی لکھتے ہیں۔ انکا دیوان غزلیات، رباعیات اور قصائد وغیرہ پر مشتمل ہے۔ فطرت نے ایک قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں لکھا جو 'شمس المناقب' کے نام سے مشہور ہے اسکا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

شب ہا ز شور نالۂ زارم ،عجب مدار
در گوش پنبہ گر نہداز صبح روزگا(۶)

دیوان کے علاوہ فطرت کی ۱۰۴/اشعار پر مشتمل ایک مثنوی بعنوان 'قصہ بنارس' بھی ملتی ہے جو بنارس کی ایک عشقیہ داستان ہے۔ مثنوی کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

روزی آن فتنہ دہر آفت دین — چہرہ آراست چو در ہای شمین
زلف را شانہ زد و گیسو بافت — وا نگہ از خانہ بہ دریا بشتافت (۷)

فطرتؔ ایک اچھے شاعر، مستند نقاد، مسلم عالم اور باعزت رئیس تھے۔ ان تمام خوبیوں نے انکی شاعری کی تکمیل اور تزیئن کی ہے۔ خاص طور پر انکی تنقیدی صلاحیت نے انکی شاعری کو ایک خاص توازن عطا کیا اور انکی ایرانیت نے ان کی زبان کو بہت حد تک فطری خوبیوں سے معمور کیا۔ شعر کے متعلق انکا نظریہ تھا کہ شعر جب تک بہت اچھا نہ ہو اسے پسند نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

موسوی شعر اگر خوب نباشد مپسند
تا نیابند دگر راہ سخن بد گوہا

شاعری میں فطرتؔ کا انداز سادہ اور بے تکلف ہے۔انکی غزلیں اپنے رچاؤ اور خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں۔مثلاً یہاں انکی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

برگل ہزار ناز بجا می کنیم خود را حنای آن کف پا می کنیم ما
نام خدا چہ حسن کلام است معزؔ! تحسین ہمی کنیم و دعا می کنیم ما

اس دور میں ریختہ گوی کا آغاز ہو چکا تھا۔فطرت نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور انکے کچھ شعر ملتے ہیں،مثلاً:

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے۔(۸)

مندرجہ ذیل سالار جنگ میوزیم،حیدرآباد اور ایران کلچر ہاؤس میں موجود دیوان فطرت کے اہم خطی نسخوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں صاف خط نستعلیق میں Acc1967 کے تحت ۳۰ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔اس نسخہ کا سائز .20.4x 11.6c.m ہے۔نسخہ کی شروعات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے۔یہ نسخہ دو شاعروں یعنی ناصرؔ علی اور موسوؔی خان کے دیوان کے کلام کا مجموعہ ہے اور ۸۵ اوراق پر مشتمل ہے،دیوان فطرت ورق ا سے ۳۰ پر مشتمل ہے۔ہر ورق پر ۱۱ سطور ہیں۔دیوان کے پہلے اور آخر کے صفحہ پر دو۔دو مہریں موجود ہیں اور کل مہروں کی تعداد ۴ ہے۔پہلی مہر **''جناب محترم''** اور دوسری مہر **''محترم الدولہ''** کے طور پر پڑھی جاسکتی ہے۔پورا نسخہ ایک ہی کاتب کی تحریر میں ہے جس میں سن کتابت اور کاتب کا نام موجود نہیں ہے۔نسخہ کی ابتدا درجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

زہی از شور سودایت نمکدان کاسۂ سرہا بیاد لعل میگون تو پر خون چشم ساغر ہا
حدیثی گفتم از بیماری چشم تو بنویسم چو نبض خستہ آمد در طپیدن تار مسطرہا

(۲) سالا جنگ میوزیم حیدرآباد میں صاف خط نستعلیق میں Acc۔3010 کے تحت ۴۳ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔یہ نسخہ ۴ شاعروں یعنی دانشؔ،موسوؔی خان،غنیؔ کشمیری اور خالصؔ کے دیوان کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں اوراق کی کل تعداد ۲۹۷ ہے۔دیوان فطرت ورق ۴۴ تا ورق ۸۷ پر مشتمل ہے۔نسخہ کا سائز .20.6x12.6c.m ہے۔ہر ورق پر ۱۴ سطور ہیں۔مجموعے کے پہلے ورق پر ایک اور دیوان غنی کے پہلے ورق پر ایک

عدد مہر موجود ہے لیکن دونوں مہریں نا خوانا ہیں۔ پورا نسخہ ایک ہی کاتب کی تحریر میں ہے لیکن کاتب کا نام اور سن کتابت موجود نہیں ہے۔ نسخہ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور ایک نثری مقدمہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ مقدمہ انتہای مرصعہ اور پر تکلف ہے جسے فطرت کی انشا کا عمدہ نمونہ مانا جاتا ہے۔ غزلیات کے ساتھ اس نسخہ میں فطرت کا ایک قصیدہ ''شمس المناقب'' بھی شامل ہے جو حضرت علی کی منقبت میں کہا گیا ہے جس کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

شبہا ز سوز نالہ زارم عجب مدار
بر کوش پنبہ گر نہد از صبح روزگار

نسخہ کا خاتمہ درجہ ذیل اشعار پر ہوتا ہے، ملاحظہ ہوں:

خال ہندی ونگہ ترک وخطش کشمیری — خندہ مصری لب ودندانش بدخشی غزنی
موسوی شعر تو ہیچ است بر نظم وحید — چہ کند باشتر مست غزال ختنی

(۳) سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں صاف خط نستعلیق میں Acc 2165 کے تحت ۴۳ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ دو شاعروں یعنی آگاہ اور موسوی فطرت کے دیوان کے کلام کا مجموعہ ہے، جس میں اوراق کی کل تعداد ۱۳۶ ہے۔ دیوان فطرت ورق ۹۳ تا ورق ۱۳۶ پر مشتمل ہے۔ ہر ورق پر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ سطور موجود ہیں۔ دیوان کے پہلے ورق پر تین مہریں موجود ہیں جن میں پہلی مہر ''**یوسف حسین قادری**'' دوسری مہر ''**فقیر الاحقر شاہ ابو محمد علی القادری ۱۲۷۰**'' اور تیسری مہر ''**شاہ ابو محمد علی قادری ۱۲۷۰**'' کے طور پر پڑھی جاسکتی ہیں۔ اسکے علاوہ ورق ۱۴ اور ورق ۹۳ پر ایک۔ ایک مہر موجود ہے۔ نسخہ کی سال کتابت ۱۲۳۴ھ اور کاتب کا نام یوسف حسین قادری ہے۔ نسخہ کی شروعات درجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

الٰہی فارغ از آسودگی کن جسم و جانم را — بمنقار ہمای فقر بشکن استخوانم را
بہ بزم تن پرستی تا بکی خاموش بنشینم — بحرف سوختن چون شمع گویا کن زبانم را

نسخہ کا ذیل کی رباعی پر نسخہ کا خاتمہ ہوتا ہے:

نظر بر گریہ مستانہ ام گر دوش میکردی — شراب جلوۂ در ساغر آغوش میکردی
بدرس حکمت ناز اینقدر رفتی سرت کردم — چہ می شد گر حدیث نالۂ ہم گوش می کردی

(۴) سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد میں خط شکستہ میں Acc 2201 کے تحت ۵۴ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ دو شاعروں یعنی امید اور فطرت کے دیوان کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں کل اوراق کی تعداد ۱۸۵ ہے۔ دیوان فطرت ورق ۱۳۱ تا ورق ۱۸۵ پر مشتمل ہے۔ ہر ورق پر ۱۲، ۱۳ یا ۱۵ سطور ہیں۔ نسخہ کے پہلے ورق پر دو

مہر موجود ہیں ان میں سے ایک مہر ''**سید اطہر علی**'' کے طور پر پڑھی جا سکتی ہے لیکن دوسری مہر نا خوانا ہے۔ دیوان امیدؔ کے پہلے ورق پر سال کتابت ۱۱۷۹ھ درج ہے۔ نسخہ کی شروعات درجہ ذیل اشعار پر ہوتی ہے:

جنونم کوس شہرت زد بدامن چونکشیم مارا پریشان نالۂ عشقم خبر کن کوہ صحرا را
دل از سعی طپیدن بیشتر در قید غم افتد بود دام دگر پرواز مرغ رشتہ پر مارا

(۵) ایران کلچر ہاؤس، نئی دلی میں خط شکستہ میں (۳۔۱۔الف۔۱۴) کے تحت ۶۷ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔ ہر ورق پر ۱۱ یا ۱۲ سطور موجود ہیں۔ نسخہ کے آخر میں اسکی سال کتابت ۲۳ رمضان ۱۱۱۷ھ اور کاتب کا نام تراب علی ہے تحریر ہے۔ نسخہ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ نسخہ کی شروعات درجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

بہ پیری شد فزوں داغ محبت چشم زارم را خزاں گل زرافشاں کرد اوراق بہارم را
عجب نبود ز شور بیقراری ھا پش از مردن کہ ھر تار کفن گردد رگ سنگ مزارم را

(۶) سالا جنگ میوزیم، حیدرآباد میں خط نستعلیق میں Acc.2367 کے تحت ۳۸ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس نسخہ کا سائز .19.0x13.6 cm ہے۔ نسخہ کے اوراق پر سطور کی تعداد مختلف ہے۔ کسی ورق پر ۱۱ سطور ہیں کسی پر ۹ کسی پر ۱۰ اور کسی ورق پر سطور کی تعداد ۱۱ ہے۔ اس نسخہ میں کاتب کا نام اور سال کتابت موجود نہیں ہے۔ یہ نسخہ نامکمل ہے اور پہلے ورق کے صرف دو یا تین شعر پڑھے جا سکتے ہیں۔ نسخہ کی شروعات درجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے:

راستی رانتوان داد بتکلف از دست شاہد زور کمان است خم بازو ہا
موسوی شعر اگر خوب نباشد مپسند تا نیا بند دگر راہ سخن بد گوہا

(۷) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں خط شکستہ میں Acc.2368 کے تحت ۷۶ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔ نسخے کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ نسخے کے اوراق پر سطور کی تعداد مختلف ہے اور سال کتابت اور کاتب کا نام موجود نہیں۔ نسخے کی شروعات درجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے:

می کنی قاصد چرا بدنام محبوب مرا
صد جواب از پارہ کردن داد مکتوب مرا

(۸) کتابخانہ خدا بخش، پٹنہ میں خط نستعلیق میں HL.2360 کے تحت ۷۹ اوراق پر پشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔ اس نسخہ کے اوراق پر سطور کی تعداد مختلف ہے۔ نسخہ کے کاتب کا نام کنہری دہلوی و سال کتابت ۱۱۱۶ھ اور نسخے کی جائے کتابت شاہجہانا باد ہے۔

(۹) کتابخانہ خدابخش، پٹنہ میں خط نستعلیق میں HL2175 کے تحت ۷ اوراق پر ۱۰۴ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔ نسخے کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ اوراق پر سطور کی تعداد ۱۱ ہے، سال کتابت ۱۲۶۰ھ ہے اور کاتب کا نام موجود نہیں۔ نسخہ کا آغاز درجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

جنونم گوش شہرت زد بدامن چون کشم مارا
پریشان نالۂ عشقم خبر کن کوہ و صحرا را

(۱۰) کتابخانہ خدابخش، پٹنہ میں خط نستعلیق میں HL.1959 کے تحت ۳۱۳ اوراق پر مشتمل دیوان فطرت کا نسخہ موجود ہے۔ نسخے کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ یہ نسخہ فطرتؔ، اسحٰقؔ، امیدؔ، وحشیؔ، نادمؔ، شریفؔ، شاھیؔ وغیرہ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اوراق پر سطور کی تعداد ۹، ۱۰ اور ۱۱ ہے۔ نسخہ کی سال کتابت اور کاتب کا نام موجود نہیں ہے۔

حواشی:

(۱) سروآزاد جلد (اول) میر غلام علی آزاد بلگرامی، ص: ۱۲۷، شائع آصفیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۱۳

(۲) ایضاً، ص: ۱۲۶

(۳) کلمات الشعراء، محمد افضل الدین سرخوش، ص: ۱۰۰، شائع ملک محمد عارف خاں پرنٹر لاہور، ۱۹۴۲

(۴) نگارستان فارس، مولانا محمد آزاد، ص: ۱۶۷، کریمی پریس لاہور، ۱۹۲۲

(۵) سروآزاد (جلد اول) میر غلام علی آزاد بلگرامی، ص: ۱۲۶، شائع آصفیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۱۳

(۶) دیوان فطرت، ورق ۹۲، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد

(۷) مثنوی فطرت، بیاض نمبر ۳۷، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد

(۸) نکات الشعراء، میر تقی میر، ص: ۱۷، شائع جے کے آفسیٹ پرنٹر دہلی، ۱۹۹۴

☆☆☆

دکنیات

سید عادل احمد
تلنگانہ اسٹیٹ میوزیم، باغ عامہ
محکمہ آثار قدیمہ، حیدرآباد، تلنگانہ اسٹیٹ

اسٹیٹ میوزیم میں قرآن کریم کے اہم مزین نسخے

چکیدہ:۔ قلی قطب شاہ کا بنا کردہ شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد اپنی تاریخی عمارتوں (چار مینار، مکہ مسجد، غوث محل، مقبرہ حضرت شاہ حسینی راجو قتالؒ، گمنبدان قطب شاہی)، تہذیب و ثقافت، باغات، پکوان، کے ساتھ ساتھ عہد حاضر میں اپنے میوزیموں کی وجہ سے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں کے میوزموں میں سالار جنگ میوزیم کا شہرہ پورے عالم میں ہو چکا ہے اس کے علاوہ دیگر میوزموں و کتب خانوں میں کتب خانہ مکہ مسجد، میوزم گمنبدان قطب شاہی اور اسٹیٹ میوزیم اپنے نوادرات کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسٹیٹ میوزیم کے نوادرات میں موجود قرآن کریم کے چند اہم خطی نسخوں کا تعارف اور کچھ اہم خطی نسخوں کی تصاویر اس مضمون میں پیش کی گئی ہیں۔

الفاظ کلیدی:۔ اسٹیٹ میوزیم، قرآن کریم، نسخہ، کتب خانہ، کتابت، سن

قرآن پاک کے قلمی نسخے جن کی مقالہ ہذا میں تفصیل بیان کی جارہی ہے، اسٹیٹ میوزیم حیدرآباد نے گذشتہ کئی برسوں میں فراہم کئے ہیں۔ یہ تاریخی حیثیت تزئین کے لحاظ اور خطاطی کے اعتبار سے اہم ونوادر ہے۔ تاریخی نسخوں میں جس کا نشان داخلہ نمبر ۹۲۶ ہے، اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ اس پر شاہجہاں کی تحریر موجود ہے۔ دیگر دو نسخے (داخلہ نشان ۱۳۲۴ اور ۱۹۶۳) علی الترتیب داراشکوہ اور اورنگ زیب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ داخلہ نشان ۹۳۴ اور ۷۰۲۱ اورنگ زیب کے کتب خانہ خاص کے رہ چکے ہیں۔ اگرچہ اس مجموعے میں بلحاظ سنہ کتابت سب سے قدیم نسخہ ۹۵۷ ہجری کا ہے لیکن بعض ایسے بھی نسخے ہیں جو رسم الخط کے لحاظ سے ان سے بھی قدیم ہیں۔ خصوصاً نسخہ داخلہ نشان ۸۷۷۱ جو خط کوفی میں لکھا ہے، غالباً پانچویں صدی ہجری کا ہے۔

ذیل میں مذکورہ بالا نسخہ جات کے کچھ خواص کی تفصیل دی جاتی ہے۔

۱۔ نشان داخلہ ۷۰۲۱، ساخت : ۶x۱۴انچ

اس قرآن کریم کی کتابت خط نسخ میں کی گئی ہے جس کے لئے نہایت اعلی معیاری کاغذ کا استعمال ہوا ہے۔ پورے کے پورے نسخے پر سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے اور ہر ورق پر مکمل سونے سے بیل بوٹوں کی نقاشی کی گئی ہے جو دیکھنے میں بہت کی اعلیٰ اور نفیس ہے۔ آخر میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مہر ثبت ہے جو اس کتاب کے شاہی نسخہ ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ نشان داخلہ ۹۳۴، ساخت : ۱۸x۲۸سنٹی میٹر

اس نسخہ کی کتابت بھی خط نسخ میں کی گئی ہے۔ یہ نسخہ بھی قابل دید ہے کیونکہ اس کے اوراق کے گوشوں پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے اور مختلف بیل بوٹوں کی بہترین نقاشی کی گئی ہے۔ اس نسخہ کے آخر میں بھی شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مہر ثبت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا یہ نسخہ بھی شاہی کتب خانہ سے تعلق رکھتا ہے۔

۳۔ نشان داخلہ ۱۳۲۴، ساخت : ۱۴x۲۳سنٹی میٹر

قرآن پاک کا یہ شاہی نسخہ شہنشاہ شاہجہاں کے فرزند اکبر داراشکوہ کے ہاتھوں کی خطاطی کا بہترین نمونہ ہے جس پر بہترین اور اعلیٰ درجہ کی منبت کاری کے ذریعہ بیل بوٹوں کی نقاشی کی گئی ہے۔ اس کے اوراق کو مختلف رنگوں سے سجایا گیا ہے۔ ہر ورق پر عربی عبارات کے ساتھ ساتھ بہ زبان فارسی حاشیہ میں ترجمہ دیا گیا ہے۔ نسخہ کی تیاری میں نفیس اور اعلیٰ قسم کے کاغذ اور سیاہی کا استعمال کیا گیا ہے۔ داراشکوہ نے کلام مجید کے اس نسخہ کی سجاوٹ کے لئے ۷ رنگوں کا استعمال کیا تھا۔ اس کی جلد بھی انتہائی نفیس ہے۔

۴۔ نشان داخلہ ۱۹۶۳، ساخت : ۱۳x۱۹انچ

اس نسخہ کے اوراق نہایت سادہ لیکن اعلیٰ معیاری ہیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اسے خط نسخ سادہ میں تحریر کیا ہے۔ یہ نسخہ آصف جاہی دور حکومت میں بی بی کا مقبرہ سے حیدرآباد دکن منتقل کیا گیا۔ شہنشاہ عالمگیر نے اس کے لکھاوٹ کے لئے سیاہ و سرخ رنگ کی روشنائی کا استعمال کیا تھا۔ اس نسخہ کی جلد بھی بے حد نفیس ہے۔

۵۔ نشان داخلہ ۹۲۶، ساخت : ۲۷x۴۵سنٹی میٹر

یہ نسخہ مغلیہ دربار کے مشہور شاہی خطاط احمد فتحی کے ہاتھوں کا شاہکار ہے جس کو ۹۸۱ ہجری میں لکھا گیا۔ اس پر شاہجہاں بادشاہ غازی کے ہاتھ کی تحریر اور مہر بطی ثبت ہے۔ اس نسخہ کی لکھاوٹ کے لئے سیاہ، سرخ اور سنہری رنگ کی سیاہی کا استعمال کیا گیا ہے۔ تمام تر کلام مجید میں جہاں کہیں اللہ پاک کا نام آیا ہے اسے سونے کی ملمع کاری سے اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر آیت کی شروعات میں بالخصوص جہاں اللہ تعالیٰ انسانوں کے مخاطب ہو رہا ہے، وہاں بھی سنہرے رنگ کا خوبصورتی

کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

۶۔ نشان داخلہ ۲۹۸۲، ساخت : ---

یہ نسخہ خط نسخ میں لکھا گیا ہے جس پر عربی عبارات کے نیچے حاشیہ میں سرخ روشنائی سے فارسی ترجمہ دیا گیا ہے۔ اس کے اوراق کے کناروں پر سونے کی نقاشی کی گئی ہے۔

۷۔ نشان داخلہ ۱۲۸۳، ساخت : ۱۵x۱۰انچ

یہ نسخہ خط ثلث میں لکھا گیا ہے جس کے اوراق بہت ہی نفیس اور اعلیٰ قسم کے ہیں۔ پہلے دو صفحے مکمل طور پر سونے سے مزین کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ پوری کتاب میں سونے کا استعمال کرتے ہوئے حاشیئے بنائے گئے ہیں۔

۸۔ نشان داخلہ ۱۲۹۹ (جلد اول اور جلد دوم)، ساخت : ۲۵x۳۶ سنٹی میٹر

اس نسخہ کی دونوں جلدیں خط مغربی میں تحریر کردہ ہیں۔ تمام تر عربی عبارات سیاہ رنگ میں ہیں اور حاشیہ پر فارسی زبان میں ترجمہ دیا گیا ہے۔ تمام اوراق پر سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے۔ دونوں نسخوں کی تیاری میں چار رنگوں کی سیاہی کا استعمال کیا گیا جن میں سیاہ، سرخ، سنہری اور آسمانی شامل ہیں۔ صفحوں کی خوبصورتی میں اضافہ کے لئے گل بوٹے ڈالے گئے ہیں جہاں رنگوں کے تال میل کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس کے باعث ان نسخوں کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

۹۔ نشان داخلہ ۸۷۷۱، ساخت : ---

یہ نسخہ بہت قدیم ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۰ تا ۱۱ صدی عیسوی کے درمیان کسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ کوفی رسم الخط لکھا گیا ہے۔ اس نسخہ کی حالت کسی قدر خستہ ہو چکی ہے اور تمام اوراق کے گوشوں کو نقصان پہنچا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کاغذ کرم خوردگی کا شکار ہو چکا ہے اور حکام نے اس کی حفاظت کے لئے خاطر خواہ قدم اٹھائے ہیں۔ تحریر پڑھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے کیونکہ تحقیق میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس کے خط اور کاغذ کی بناوٹ عہد قدیم کے نسخوں سے کافی مماثلت رکھتی ہے۔ یہ نسخہ، ہندوستان کے چند قدیم نسخوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مزین نسخوں میں اعلیٰ پائے کی نقاشی موجود ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مشرقی امراء اور شاہی خانوادے کتابوں کو دیدہ زیب اور خوبصورت بنانے میں دل کھول کر رقم خرچ کرتے تھے۔ رنگ کاری میں جواہرات کا استعمال نازک اور پیچیدہ نقوش جو کتاب کے صفحوں پر ہی نہیں بلکہ اس کی جلد پر بھی موجود ہیں۔ کتابت کے اعلیٰ معیار سے صرف اساتذہ فن ہی کے کمال کا اندازہ نہیں ہوتا جنہوں نے کتاب میں کام کیا ہے، بلکہ ان کے قدردانوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ میوزیم کے شعبہ مخطوطات میں کلام مجید کے ۱۰۰ سے بھی زائد نسخے موجود ہیں جو مختلف رسم الخط جیسے خط کوفی، خط

مغربی، خط نسخ، خط ثلث، خط ریحان، خط طغریٰ اور خط غبار کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ بعض نسخے مشہور خطاطوں مثلاً یاقوت، محی ھروی، احمد فتحی، محمد بیگ عرب، محمد صالح شاہجہانی، محمد نعیم اصفہانی، حسین بن محمد رضا شیرازی وغیرہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض نسخوں کی اصل جلدیں ہنوز باقی ہیں جن سے اس دور کی بہترین جلد سازی کے کمال کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ذیل کچھ نسخوں کے عکس بھی پیش کئے جارہے ہیں تاکہ قارئین ان کی تزئین کاری اور اہمیت کا اندازہ لگاسکیں۔

آئینۂ تحقیق

عاطفہ جمال

معاون مدیر

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

اشاریہ: دبیر ۲۰۱۶ء

محبان ادب کی دعاؤں اور تمام اہل قلم کی کاوشوں کے اس ثمرہ یعنی ''دبیر'' کی بفضل ایزدی تیسری جلد بھی مکمل ہوگئی مذکورہ جلد میں جن اہل قلم کی تخلیقات شامل ہوئی ہیں۔ ان تمام اہل علم وقلم کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ جریدہ کے اس حصہ میں ہندوستان یا بیرون ہند کی دانشگاہوں میں ہونے والی پی ایچ ڈی کی فہرست پیش کی جاتی رہی ہے۔ مگر اس شمارے میں پچھلی جلد کے تمام شماروں کی فہرست پیش کی جارہی ہے تاکہ جن ارباب علم تک کوئی شمارہ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا ہو وہ کم از کم اس کی مشمولات کی حد تک واقفیت حاصل کرسکیں۔

☆ **فہرست مندرجات: جلد سوم/شمارہ اول (جنوری تا مارچ ۲۰۱۶ء)** ☆

عنوان/مقالہ نگار/صفحہ

۱۔ اداریہ/ازلان حیدر/۴

مقالات

۲۔ مجالس المومنین میں نامور علماء کے احوال وآثار/ ڈاکٹر زہرہ فاروقی/۸

۳۔ فتح الکنوز: ایک جائزہ/ڈاکٹر شاہ شبیہ انور علوی/ ۱۴

۴۔ فارسی اور اردو غزل میں پیکر تراشی/ آزاد حسین/ ۲۰

۵۔ سترہویں صدی میں بہار میں فارسی شاعری/ محمد ضیاء الحق/۲۵

۶۔ مخدوم شاہ طیب بنارسی احوال وآثار/ ارمان احمد /۳۲

میراث خطی

۷۔ غالب انسٹیٹیوٹ.....میں دیوان مخفی کے قلمی نسخے کا تعارف/ ڈاکٹر سید کلیم اصغر/۳۸

دکنیات

۸۔ سید اقبال احمد اقبالؔ/سید الیاس احمد مدنی/۴۴

آئینۂ تحقیق

۹۔ پایان نامہائے شعبۂ فارسی، جے این یو، نئی دہلی/ وسیم راجا بٹ/۴۷

چشم بینش

۱۰۔ مثنوی گوئی بہ عہد اورنگ زیب: ایک تعارف/احمد نوید یا سر ازلان حیدر /۶۹

English Articles:

1. A recent treasure troves of Vijyanagar coins at Garlabyyaram, Khammam District: A Study/ B. Mallu Naik/ 3

2. Modern Persian Short Stories: Development & Evolution/ Dr. Sarfaraz A. Khan/ 6

3. SAMA: A Musical contribution of Khusrow in dedication to Nizamauddin Aulia Chishti...../ Dr. Mousumi Roy/ 13

☆ فہرست مندرجات: جلد سوم/شمارہ دوم (اپریل تا جون ۲۰۱۶ء) ☆

عنوان/مقالہ نگار/صفحہ

۱۔ اداریہ/ازلان حیدر/۴

مقالات

۲۔ مجالس جہانگیری/پروفیسر عارف نوشاہی/پروفیسر معین نظامی (ترجمہ: وجیہ فرقان)/۵

۳۔ تاریخ ہند کا اہم مآخذ۔ ملخص شاہجہاں نامہ/پروفیسر محمد عابد حسین/۴۹

۴۔ عہد اورنگ زیب کی ایک علمی شخصیت: شاہ عبدالرحیم دہلوی/پروفیسر طاہرہ وحید عباسی/ ۵۴

میراث خطی

۵۔ حضرت تپاںؔ کا فارسی قصیدہ ''مطلع الانوار''/پروفیسر رضوان اللہ آروی/۵۸

دکنیات

۶۔ دارالضرب: گولکنڈہ/سید عادل احمد/۷۲

آئینۂ تحقیق

۷۔ پایان نامہائے شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر/ لطیف احمد سلمانی/۷۶

چشم بینش

۸۔ حیات سعدی (تحشیہ وتعلیقات: سید محمد اسد علی خورشید: ایک تعارف/ازلان حیدر/۷۸

English Aritcles:

1. Assessment of Hindi & Sanskrit Literature/ Dr. Zafar Iftekhar/ 3

2. Musical Instruments as depicted in the miniature paintings from the State Museum: A study / B. Ganga Devi/ 9

☆ فہرست مندرجات: جلد سوم/شمارہ سوم (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء) ☆

عنوان /مقالہ نگار/صفحہ

۱۔ اداریہ /ازلان حیدر/ ۴

مقالات

۲۔ میر سید علی ہمدانی کی کشمیر میں فارسی زبان/پروفیسر عزیز عباس۔محمد الطاف بٹ/۵

۳۔ برہمنؔ کی تصنیف ''چہار چمن'' پیغام عبرت/پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی/۲۰

۴۔ ہمائندہ نسوان ایرانی: سیمین بہبہانی/ڈاکٹر صالحہ رشید/۲۸

۵۔ نواب شاہجہاں بیگم بحیثیت شاعرہ/ ڈاکٹر شمسہ عارف/ ۳۵

۶۔ قوسؔ حمزہ پوری کی وطنی شاعری/ ڈاکٹر فضل الرحمان/ ۴۵

میراث خطی

۷۔ دیوان ناصر علی سرہندی کے خطی نسخے/ ڈاکٹر ناظرہ اسحٰق/ ۵۱

دکنیات

۸۔ مضطر مجازؔ و دیگر مترجمین اقبالؔ: ایک تقابلی مطالعہ/ ڈاکٹر عالم اعظمی/ ۶۰

آئینۂ تحقیق

۹۔ پایان نامہائے شعبہ فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد/ کنیز فاطمہ/ ۷۰

چشم بینش

۱۰۔ سیرت حضرت مخدوم شاہ مینائؒ لکھنوی / احمد نوید یاسر ازلان حیدر

English Aritcles:

1. Impact of Rumi's Miracle & Sufism on M.F. Gulen's...../ Dr. Mohammad Faique/ 3

2. Ethic and Sheikh Abdul Qadir Gilani/ Hifjul Hussain Choudhri/ 9

☆ فہرست مندرجات: جلد سوم/شمارہ چہارم (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء) ☆

عنوان/ مقالہ نگار/ صفحہ

۱۔ اداریہ/ ازلان حیدر / ۴

مقالات

۲۔ عزم سیر نجف وطوف حرم ہے مجھ کو/ پروفیسر عارف نوشاہی/ ۵
۳۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات/ ڈاکٹر زہرہ خاتون/ ۲۵
۴۔ خزائن الفتوح کی تاریخی اور ادبی اہمیت/ ڈاکٹر انصار الحق/ ۳۱
۵۔ فن ترجمہ ادبیات فارسی کے تناظر میں/ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں/ ۳۴
۷۔ قدیم ہندوستان میں فن صحافت/ ڈاکٹر نیلوفر حفیظ /۴۱

میراث خطی

۸۔ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں ابن سینا کے مخطوطات/ ڈاکٹر عطا خورشید / ۴۹

دکنیات

۹۔ بہمنی دور میں فارسی زبان وادب/ ڈاکٹر نکہت فاطمہ/ ۵۵

آئینۂ تحقیق

۱۰۔ پایان نامہائے شعبہ فارسی، دانشگاہ ہندوی، بنارس/ محمد کاشف رضا/ ۶۸

چشم بینش

۱۱۔ غالب کے کلام میں سائنسی کہکشاں (مرتبہ: محمد آزاد حسین)/ ڈاکٹر محمد ارشاد احمد/ ۷۰

English Aritcles:

1. Journey of Iranian films after the Islamic revolution/ Dr. Sarfaraz Ahmad Khan/ 3

2. Qutbshahi Period: An era of Indo-Iranian literary cutural activities/ Dr. Qaiser Ahmad/ 12

3 The role of Afghan nobles during the Delhi Sultanate/ Saba Sammreen Ansari / 18

☆☆☆

چشم بینش

ازلان حیدر

نفائس الانفاس (مرتبہ حضرت خواجہ رکن الدین عماد کاشانی) ترجمہ شبیب انور علوی: ایک جائزہ

ہندوستان میں فارسی ادبیات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زبان وادب کے کئی شعبوں کی بناء ہی اسی سرزمین میں پڑی اور کئی ایسے بھی شعبہ ہیں جن کی بناء تو ایران میں پڑ چکی تھی مگر ان کو جلا وتابنا کی یہیں ملی۔ فارسی زبان و ادب اور اخلاق وتصوف کا رشتہ جسم وجان سا ہے چاہے وہ شعر ہو یا نثر ہر جگہ صوفیانہ افکار واصطلاحات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ادبیات فارسی کا ایک اہم جز یعنی ملفوظات نویسی کا رواج بھی ہندوستان جنت نشان میں ہی عروج پاتا نظر آتا ہے ملفوظات وفرمودات سے جہاں ایک طرف دین متین کی تبلیغ وتشہیر عمل میں آئی وہیں دوسری طرف یہ شہ پارے اپنی دیگر خصوصیات کی بناء پر صرف ادب کا ہی بلکہ تاریخ کا بھی اٹوٹ حصہ بن گئے۔ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیاء، مفتاح العاشقین، افضل الفوائد، راحۃ المحبین سراج الہدایہ، گنج الاسرار، خلاصۃ العارفین، چہل مجلس، معدن المعانی، لطائف اشرفی، ثمرات الحیات، مکتوبات صدی وغیرہ ملفوظات صوفیاء اپنی اخلاقی، ادبی، تاریخی، ثقافتی اور اصلاحی تعلیمات واندرجات کی وجہ سے اپنے زمانہ ترتیب سے لے کر آج تک ادبمیں اعلیٰ پر فائز ہیں۔ ایسے ہی شاہکاروں یا شہ پاروں سے ایک نفائس الانفاس بھی ہے جو کہ حضرت خواجہ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ہیں اور ان کے مرتب حضرت خواجہ رکن الدین عماد کاشانی ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام والمسلمین برہان الحق والحقیقۃ والدین ابن حضرت محمد بن محمود ناصر الملقب بہ غریب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت با سعادت ۶۵۴ھ بمقام ہانسی (پنجاب) ہوئی آپ حضرت خواجہ جمال الدین ہانسویؒ کے بھانجے ہوتے تھے آپؒ نے بچپن میں ہی فقہ معانی وتفسیر وحدیث وغیرہ کے علم سے فراغ حاصل کر لی تھی آپ کو بچپن سے ہی طلب حق وریاضت ومجاہدے کا شوق تھا اور اس ذوق وشوق کو حضرت سلطان المشائخ کے دامن عاطفت میں اور جلا ملی، کثرت عمل، ریاضت ومجاہدات نے آپ کو سلطان المشائخ کا جلیل القدر اور چہیتا خلیفہ بنا دیا۔ آپؒ کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خلافت وکلاہ کے ساتھ دکن تبلیغ ورشد وہدایت عوام کے لئے بھیجا آپؒ نے تمام عمر اپنے فیض باطنی وروحانی سے عوام الناس کو مستفیض فرمایا اور ۷۳۷ھ میں محبوب حقیقی کی طرف کوچ کر گئے روضہ خلد آباد میں ہے اور آج بھی مرجع خلائق ہے۔

حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات چار مجموعوں میں مرتب ہوئے جو بی الترتیب اس طرح ہیں احسن الاقوال مرتبہ خواجہ حماد کاشانیؒ، غرائب الکرامات وبقیۃ الغرائب مرتبہ خواجہ مجدالدین کاشانیؒ اور نفائس الانفاس مرتبہ خواجہ رکن الدین عماد کاشانی معروف بہ دبیرؒ۔ اب ڈاکٹر شبیب انور علوی کاکوروی (استاد شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی) نے اپنی محنت وکاوش سے نفائس الانفاس کا ترجمہ مع مبسوط مقدمہ خانقاہ کاظمیہ قلندریہ سے شائع کیا ہے۔ ترجمہ کی روداد یوں بیان فرماتے ہیں:

''غالباً تین سال قبل راقم الحروف کو مکرمی جناب عبدالحمید عبدالمجید صاحب خلد آبادی زاداجرہ نے نفائس کا ایک نسخہ لاکر دیا اور ترجمہ کی خواہش ظاہر کی، راقم نے اس کو حضرت زبدۃ العارفین، سند الفاضلین، غزالی وقت، مجدد زماں شیخی و قبلتی ومولائی ومرشدی، ملجائی وملاذی، سیدی وسندی واستاذی ومن علیہ اللہ ورسولہ استنادی واعتمادی مکمل علوم اجدادہ الابحر حافظ شاہ محمد مجتبیٰ حیدر قلندر عطر اللہ تعالیٰ مشہدہ الانور کی خدمت مبارکہ میں پیش کیا اور آپ کے حکم پر ترجمہ شروع کیا اس نسخہ میں ۱۷ سطری ۱۳۶ صفحات ہیں، خط نستعلیق اور کہیں کہیں بہت شکست اور غلطیاں بیشمار، بعض جگہ تو نفس مضمون ہی خبط ہوا جاتا تھا، مزید برآں یہ کہ نسخہ ناقص بھی ہے یعنی درمیان میں کئی صفحات ندارد۔ خیر ان سے قطع نظر ترجمہ ہوتا رہا پھر یہ معلوم ہوا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں بھی ایک ناقص نسخہ موجود ہے، راقم نے اس سے تقابل کیا اس میں ۱۳ سطری مسطر کے ۱۶۸ صفحات ہیں خط تقریباً یکساں ہے، لیکن نسخہ کچھ پرانا ہے چونکہ اصل کتاب میں اصول املاء قدیم طرز کا تھا لہٰذا اسے جوں کا توں سمجھنے کی کوشش کی، لیکن کتابت کی غلطیاں اتنی زائد تھیں کہ جگہ جگہ اس میں بھی اصلاح کرنا پڑی۔''

نفائس الانفاس میں رمضان ۷۳۲ھ سے صفر ۷۳۸ھ یعنی حضرت غریب کی وفات تک کل ۴۹ مجالس کے احوال قلم بند کئے گئے ہیں ورمترجم نے بہ سلسلہ مجلس بڑی محنت وعرق ریزی سے ان دقیق مسائل کا ترجمہ آسان اردو میں فہرست مندرجات اس طرح ہے: مقدمہ از مترجم، دیباچہ نفائس الانفاس از مولف اور اس کے بعد تمام ۴۹ مجالس کا ترجمے، آخر میں تاریخ وصال حضرت برہان الدین غریبؒ بھی اپنے ترجمہ کے ساتھ درج کی گئی ہے۔ یہ ترجمہ ۱۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، ناشر خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری شریف ہے قیمت ۲۰۰ روپئے ہے اور خوبصورت سرورق کے ساتھ متوسط تقطیع پر شائع کی گئی ہے۔

☆☆☆

S. No.: 10 ISSN- 2394-5567

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quaterly Literary Research Journal For Persian Literature)

VOLUME:- IV **ISSUE:- I**

JANUARY to MARCH 2017

Editor:
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:
Dabeer Hasan Memorial Library ,12, Choudhari, Mohalla, Kakori, Lucknow, U.P., India-226101
Email:- **dabeerpersian@rediffmail.com**
Mob. no:- 09410478973

Review Comiitee

Professor Azarmi Dukht Safavi,
Director IPR, AMU, ALigarh.
Professor Shareef Hussain Qasmi,,
Ex-Dean, F/0 Arts, DU, Delhi,
Professor Mohammad Iqbal Shahid , Dean
F/o Laguages Islamic & Ori. Lear. , GCU,
Prof. Abu Musa Muhammad Arif Billah,
Al Biruni Faundation, Dhaka.
Professor Abdul Qadir Jafery,
Ex- HOD Arbic & Persian, A. University.

Editorial Board

Professor Syed Hasan Abbas, BHU,
Professor S M A Khursheed, AMU,
Professor Aleem Asharaf Khan, DU,
Dr. Shahid Naukhez Azmi, MANUU,
Dr. Muhammad Aqeel, Persian, BHU,
Dr. Muhammad Qamar Alam, AMU,
Dr. Mohd. Tauseef, AMU
Zunnoorain Haider Alavi, Editor
Bi-Annual **TASFIYA**, Kakori, Lucknow.
Naqi Abbas Kaifi, Editor
Quaterly **NAQD-O-TAHQEEQ**, Delhi.
Arman Ahmad, Editor
Quaterly **IRFAN**, Chapra, Bihar.

Co-Editor

Atifa Jamal
Research Scholar, Department of Persian,
Lucknow University, Lucknow

Advisory Board

Professor Ziyauddin Ahmad Shakeb Kakorvi,
Professor Umar Kamaluddin, Lucknow
Professor Syed Mohd Asghar, Aligarh
Professor Panna Lal, HOD History,AU
Professor Ram Sumer Yadav, Lucknow
Professor Musheer Hussain Siddiqui, LU
Dr. Gulfihsa Khan, AMU
Dr, Ata Khursheed, MA Liberary, AMU
Dr. Pradeep Jain, Allahabad.
Dr.(Ms.) Berna Karagözoglu, Agri Ibrahim
Çeçen University, Turkey.
Dr. Iftikhar Ahmad, M A College, Colcata.
Dr. Alam Azmi, KMCUAFU, Lucknow.
Dr. Arshad Qadiri, Lucknow University,
Dr. Sakina Khan, HOD Persian, MU,
Dr. Shahram Sarmadi, Tehran, Iran.
Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Lucknow
Dr. Prashant Keshavmurthy, Macgill Univ.
Inci Celikel, Anatoliya Univerity, Turky.

Dr. Pradip Tandon

Ex. Research Associate, SIS, JNU, New Delhi

Spread of Sufism in Indonesia

What is Sufism

Sufism is that mode of religious life in Islam in which the emphasis is placed on unity of human being with God through spiritual love, ascetic exercise, contemplation, renunciation and self-denial. There are various opinions regarding the etymology of the term Sufism. In Arabic Sufism is called Tasawwaf. A number of opinions exist among the scholars as to the derivation of the word Tasawwuf. Some of the scholars are of the opinion that the term Tasawwuf is derived from the word Sof 'wool' and those who wear Sof made garments are called Sufi. A great Sufi Shahabuddin Shaharwardi writes in his famous book entitled 'Awareful -Ma'aref, "Derivation of the term, 'Tasawwuf' from Sof is more suitable and appropriate to any other derivation" 1. In fact from the earliest time Sof made garments were regarded as a symbol of simplicity, virtuousness and avoidance of luxurious life and Sufis put on Sof made garments to distinguish themselves from those who indulged in luxury and comfort of life. Since early time some have also linked the word Sufi with Sufiya (Purified or chosen as friend by God.) The derivation of the name Sufis was a long subject of dispute. Most Sufis favours the theory that it is derived from 'Safa', 'Safa' means Purity and that Sufi is one of the elects who have become purified from all worldly defilements. Other would connect it with 'Saff means rank, as though the Sufis were spirituality is the first rank in virtue of his Communion with God.2

The Sufism had become part of the Islamic doctrine even before the second century of Hijra. According to Allami Jami , the author of Nafkhatol Uns, Abul Hashim Kufi (d. 150 A.H.) was the first person who was given the title of Sufi. The early Sufism was characterized by the renunciation of worldly pleasures and intense

fear of God and His judgments. The way of Sufism was way of truth and salvation. The early Sufis were orthodox Muslims in regard to their beliefs and practices. They were men of deep religious feeling and fundamentally inspired by the Qoranic conception of a transcendent God. The outstanding figure in this early ascetic movement was Hasan Basari(642-728) . He was both an outstanding scholar and an eloquent speaker. Preaching asceticism in his sermons , he expressed his idea in this way: " make this world into a bridge over which you cross but on which you do not build" Rabeya Basriya (d.801) , Malik Dinar, Sufyan Sauri, Shaqoq Balkhi are the other notable sufis of this period.

The asceticism of early Sufism gave birth to the regular movement of Sufism towards the end of eight century of Christian era. At Baghdad , under the Abbasids , the Sufis theology attained its perfection . The most important figure in this period was Zonnun Misri (796-681) who gave a definite turn to Sufi doctrine by introducing into teaching about ecstasy and theory of gnosis. He was the first to teach the real nature Marefat and said, "the Gnostic needs no state, and he needs only his lord in all states. Love what God love and hate what God hates". Sufism is not limited to any race, creed, language or nation but it has spiritual experience. It is based on the spiritual prayers and resignation to the will of God. A Sufi is always in love with God as love of God is the soul of Sufism. For a Sufi, God is beloved and men are His lover. Abu Sayed Abul Khair, a great sufi-poet, defines the Sufism in the following words:

"Sufism is two things: to look in one direction and to leave in one way. Sufism is a name attached to its object; when it reaches its ultimate perfection, it is God. The Sufi is he who is pleased with all that God does, in order that God may be pleased with all that he does. Sufism is patience under God's commanding and forbidding and acquiescence and resignation in the events determined by divine providence. Sufism is the will of creator concerning His creatures when no creature exists. To be a Sufi is to cease from taking trouble; and there is no greater trouble for thee than thine own self, for when thou art occupied with thyself, thou remains away from God."3

Advent of Indonesia by Islam

Sufism first came to Indonesia along with the spread of Islam brought to the region by Muslim traders. There is still controversy among scholars about who first brought Islam to Indonesia. Some points to the Muslim traders from Persia and Gujarat, others offer evidences of Arab influences on early Indonesian Moslems. But everyone agrees that Islam entered Indonesia peacefully without holy wars or rebellions. Sufism also played a big role in spreading Islam among common Indonesians who were and still very fond of mysticism. Moslem traders had visited the Indonesian archipelago for centuries, some of them had settled there or even might had converted some Indonesians. Evidence of their presence can be found at tombstones of Moslem scholars at Baros, North Sumatra, bearing the date of 44-48 Hijri or 665-669 AD. They are Syaikh Rukunuddin, Syaikh Makhmud, Tuanku Batu Badan, and Tuanku Ambar. A Chinese document also reported existence of Arab communities in Kalingga kingdom in Java in the 7th century.4 These Arabs might also have introduced Islam to the local people. There is also a tombstone of a Moslem woman, Fatimah binte Maimun, in Gresik, East Java, bears the date of 461 Hijri or 1082 AD. It's possible that small Moslem communities had already formed at that time in the main ports of Java and Sumatra. The Hindu and Buddhist rulers of that era might have been tolerant to them and allowed them to preach Islam among their subjects. But it was not until the 13th century when the rulers of Samudra Pasai and Perlak at northern Sumatra started to embrace Islam and made the first Islamic kingdoms in Indonesia. The most obvious evidence of this is the tombstone of the first Islamic ruler of Samudra, Sultan Malik Al-Saleh, which bears the date 1297. These kingdoms were reported by Marco Polo who visited Perlak in 1292, and also by Ibn Batutta, the famous Moroccan traveler, who on his way to China in 1341 stopped at Samudra and became a royal guest to the Moslem ruler there, Malik Al-Zahir. This Sultan might have practiced Sufism because Ibn Batutta described him as 'a humble hearted man who walks on foot to the Friday prayer'. Having their position on the gate of Malacca strait, which was a busy trade route, the kingdoms had no difficulties in further introduction of Islam and Sufism to the region and

beyond to Java and East Indonesia

Sufism in Indonesia

According to the popular believe Walisongo (Wali = Sufi saint, songo = nine) were instrumental in spreading Islam in Java and other island. Around 1445 AD Sunan Ampel was given authority over Ampel region by his uncle, Sri Kertawijaya, king of Majapahit. At that time Ampel region has about 30,000 inhabitants. Ampel was located next to the main port of the kingdom, Jenggala Manik, which made it a strategic place to spread Islam with aid from the Moslem merchants in Java. These merchants had already made smalll communities along the northern coast of Java since the 11th century. Sunan Ampel must have great influence over them and received donations to finance the Islamic da'wah (propagation of the faith). Slowly but sure, the mission gained more and more new converts from the nobles, local people and foreign merchants. The donations also financed Sunan Ampel's pesantren, where Moslem children studied Islam to become future missionaries for the archipelago. In a short time, Ampel grew to be a centre for studying Islam in the island and hosted religious scholars from various countries. Sufism was the base of Sunan Ampel's teachings, which prevented confrontation among scholars from various mazhab (sects) in Islam, and attracted new converts by its non-aggressiveness.

Sunan Ampel's aunt, Darawati, died in 1448. But before that, she had succeeded in persuading her husband, Sri Kertawijaya, to embrace Islam. The conversion of the king had ignited discontent among the Hindu nobles and priests who later revolted against him. The king was finally murdered in 1451, and the throne was taken by Sri Rajasawardhana. The coup gave a threat to further preaching of Islam, which was protected under the rule of Sri Kertawijaya. Aware of this danger, Sunan Ampel planned to send missionaries to all provinces of Majapahit in Java. The missionaries' goal was to build Islamic centres in all provinces to strengthen the da'wah over the island and also to anticipate the possiblity of the destruction of Islamic community in Ampel by Majapahit's army. The group of the missionaries was called Bayangkare Ishlah by Sunan Ampel.

The Majapahit kingdom in the mid of 15th century was divided into nine provinces: Trowulan (the capital), Daha, Blambangan, Matahun, Tumapel, Kahuripan, Lasem, Wengker, and Pajang. Sunan Ampel appointed the following persons to every strategic regions in the provinces to preach Islam through Sufism:

"Raden Ali Murtadho, brother of Sunan Ampel, was appointed to preach at the region of Gresik and Tuban. He was also called Raden Santri Ali in that area.

"Abu Hurairah, cousin of Sunan Ampel preached at Majagung region and had the title Pangeran (Prince) Majagung. He was also called Raden Burereh by the local people.

"Syekh Maulana Ishak, Sunan Ampel's uncle, went to preach at the province of Blambangan and had the title Syekh Waliyul Islam. He was also called Syekh Wali Lanang.

"Maulana Abdullah, Sunan Ampel's uncle, preached at Pajang and had the title Syekh Suta Maharaja.

"Kyai Banh Tong was assigned to preach at Lasem province and was called Syekh Bentong by local people. His daughter was one of king Majapahit's many wives.

"Khalif Husayn, Sunan Ampel's cousin, preached at Madura, an island northeast of Java.

"Usman Haji, son of Khalif Husayn, preached at Ngudung in Matahun province and had the title Pangeran Ngudung.5

These eight missionaries were called Bayangkare Ishlah by Sunan Ampel. They were all Sufi masters and made Sufism their basic concept in spreading Islam. Their charisma and intellect helped won sympathy from local rulers and many were married with girls from noble families. Sunan Ampel married Nyi Ageng Manila (or Dewi Condrowati), daughter of a high ranking officer in Majapahit kingdom. Syekh Maulana Ishak married daughter of Prabu Menak Sembuyu (Sadmuddha), king of Blambangan. Kalifah Husayn and Ali Murtadho married daughters of Arya Baribin, ruler of Madura. Maulana Abdullah married Endang Senjanila from Tirang. By having family ties with the local ruler they could preach Islam effectively.

The reason of Sunan Ampel's decision to form a council of Islamic missionaries was to build a flexible type of Islamic missionary. The Nine Wali (Walisongo), were very much aware of Javanese people's high appreciation toward art. Therefore they exploited it for the benefit of Islam. These Sufi saints (Wali) creatively manipulated the already popular Hindu epic of Ramayana and Mahabharata to teach Islam through the shadow-puppet play (wayang kulit) and gamelan (set of metal instruments) music. They also invented songs, poems, sport games, festivals, and even child's play and traditional cakes (!) to propagate Islam and Sufism. These tactics proved to be very effective in making Islam the major religion among the Javanese. The Walisongo and other Sufi Saints who lived after them used persuasive strategies and Sufistic approach to win the heart of the Javanese people. Sufi symbols were hidden in the stories, on the characters, and on the shape of the puppets. They also converted old and created new stories, poems and songs which had Islamic teaching but used local names and languages. They included local myths and folklores with Islamic concepts and names. They combined the Islamic Hijri calendar with the Javanese Saka calendar. They put many Arabic verbs and nouns in the Javanese vocabulary. They changed local ceremonies into Islamic festivals and invented sport games and child's plays with Islamic teachings, even traditional food and cakes with Sufi symbols. This strategy was very successful in converting almost all of Java into Islam in about a century.

The council can be viewed as religious as well as a political movement, because Sunan Ampel also started to build military power in Demak, Giri (Gresik) and Tuban. Some previous Sufi masters were not included in the council for various reasons. Syekh Suta Maharaja had died after the attack from Pengging kingdom. Raden Husen has been assigned as Tandha (a government position in Majapahit kingdom) in Terung. While Ali Murtadho, brother of Sunan Ampel, was assigned to maintain Moslem military unit in Gresik and Tuban with Raden Burereh.At that time the council's center was still at Ampel, which was close to Majapahit's capital, Trowulan. Sunan Ampel thought that it was necessary to move the center to a new place far from Trowulan so that they could have more freedom to manage their

movement. Walisongo had two strong bases at that time, Demak and Giri, which had many followers and strong military units. Demak was managed by Raden Fatah (Raden Hasan), while Giri was managed by Raden Ainul Yaqin (Raden Paku). These bases were the alternatives of the council's new center, but Giri was still close to Trowulan, so the best option was to move the center to Demak. Soon afterward the council started to construct a large mosque at Demak which would be used not only as a center for the council to spread Islam but also as a center for Islamic and Sufism studies. The Demak Mosque was completed around 1477 AD. Then to prevent rivalry among Raden Fatah and Raden Paku, Sunan Ampel wisely adopt them as his son-in-laws. Raden Fatah was married to Dewi Murthosiyah, while Raden Paku was married to Dewi Murthosimah. Both are Sunan Ampel's daughters from his marriage with his second wive, Nyai Karimah.6

The two bases of Walisongo (Demak and Giri) which grew stronger and stronger everyday were always under the watchful eyes of the Majapahit kingdom. The new ruler of Majapahit, Bhre Kertabumi, the third successor of Sri Rajasawardhana, was suspicious of the leader of these two bases. It was because Raden Fatah was son of Sri Kertawijaya, previous king of Majapahit who was toppled and replaced by Sri Rajasawardhana. While Raden Paku's mother was the granddaughter of Bhre Wirabumi of Blambangan, an old enemy of Majapahit whom they defeated long before that. However, their position in the Walisongo council gave them a temporary protection, because Sunan Ampel was still respected by the Majapahit ruler, and there were many high ranking officer of Majapahit still loyal to Sri Kertawijaya and to his son, Raden Fatah.

While Syekh Maulana Malik Ibrahim died in 1419, is regarded by the Indonesian Moslems as a member of Walisongo because he was a great Wali of his time and built the first pesantren (Islamic school) in Java. He was also Sunan Ampel's cousin. In fact there were many other Sufi Masters from various countries who came to Java around that time. Some of them are:

"Syekh Ibrahim As-Samarkandy, father of Sunan Ampel

"Syekh Maulana Ishaq, brother-in-law of Syekh Ibrahim As-Samarkandy

"Maulana Ahmad Jumadil Kubra

"Maulana Muhammad Al-Maghrobi

"Maulana Malik Isro'il

"Maulana Muhammad Ali Akbar

"Maulana Hassanuddin

"Maulana Aliyuddin

"Syekh Subakir 7

The second wave of missionaries was sent a few years later by Sunan Ampel to reinforce the first one:

"Raden Hasan or Raden Fatah, son of Sri Kertawijaya with his Chinese wife, preached at Glagah Wangi, Bintara, in the Lasem province to replace his grandfather, Syekh Bentong. He had the title Pangeran Bintara.

"Raden Husen, half-brother of Raden Hasan, was appointed to preach at Trowulan, the capital of Majapahit.

"Raden Makdum Ibrahim, son of Sunan Ampel, was sent to Daha, and had the title Pangeran Anyakrawati. He was later known as Sunan Bonang.

"Raden Hamzah, son of Sunan Ampel, was assigned to preach at Tumapel and had the title Pangeran Tumapel. He was also known as Syekh Ambyah or Syekh Kambyah.

"Raden Mahmud, son of Sunan Ampel, also known as Syekh Sahmut, preached at Sepanjang, Kahuripan, and had the title Pangeran Sepanjang.

Sunan Ampel and his coleagues used persuasive approach to attract the Javanese people to Islam. They exploited Hindu myths and beliefs to spread Islamic teachings. They made new stories related to the myths and include Islamic beliefs in them. The stories gradually became popular among the Hindu people and made them familiar with Islam.

The Bhayangkare Ishlah also tried to avoid conflict with local rulers by making good relationship with them. But their movement was not without trouble and difficulties. Syekh Maulana Ishak was forced to leave Blambangan because of false accusation from one of the king's officer. His pregnant wife was left behind.

Later she bore a son, Raden Ainul Yaqin or Raden Paku, who was taken by Sunan Ampel as his disciple. Syekh Maulana Ishak, according to "Babad Tanah Jawi", after leaving Blambangan went back to Pasai kingdom in Sumatra. But according to "Serat Kandaning Ringgit Purwa", he went to Semarang and preached Islam to Batara Katong from Wengker. In other areas they were still rejected by the Hindu rulers like Makdum Ibrahim who had troubles with nobles of Daha when he tried to build a mosque there.In Pajang, Syekh Suta Maharaja's base was attacked by the army of Prabu Andayaningrat from Pengging, who didn't like the growth of Islam in that area. Syekh Suta Maharaja escaped to Demak and died there. Later, the Pengging army was finally defeated by Raden Hasan.These confrontation forced Sunan Ampel to reconstruct his strategy in spreading Islam in Java. He needed to form a group of charismatic Islamic preacher backed by a strong political power which led to the birth of Walisongo, a council which approach of Sufism finally succeeded in converting almost all of Java to Islam. Soon the steps of Walisongo were followed by Sufi saints and Moslem preachers in other islands of Indonesia, and created a new face of the art and culture of Indonesia which rooted deeply in the everyday life of the people until now. The culture which had resisted threat from various foreign invaders and colonialists, the communists, and the modern western culture.

In 1436, Prameswara, the ruler of Malacca in the Malayan Peninsula, embraced Islam and was entitled Sultan Megat Iskandar Syah. Later he freed his sultanate from China which was its patron since 1402. Gradually, he took control on the trade route in the archipelago. By 1500, Malacca had become the greatest emporium in Southeast Asia, and all the trading ports of the western archipelago were centralized on Malacca. The most important of these were the ports on northern coast of Java, then still a Hindu island. The last great Hindu kingdom of Java, Majapahit which capital is in Trowulan, had almost collapsed when Malacca began its supremacy on the region. Known to have subdued almost all of Southeast Asia kingdoms, the great empire waned after the death of its greatest ruler, Hayam Wuruk, in 1389. A civil war erupted from 1402 to 1406 helped further destruction

of the kingdom. Though reunited in 1429, Majapahit had lost its control on many trading ports in the archipelago to the emerging Malaccan sultanate. Taking advantage of the situation, the rulers of the Javanese coastal cities were seeking independence from the inland Hindu kingdoms of Majapahit and Pajajaran.8 Slowly but sure, intermarriage between Moslem traders and local nobles brought tight relationship with Malacca. Thus, opened the gates of Java to Islam. Ibn Batutta, the famous traveler from Moroco, also mentioned a Sufi scholar from Indonesia, Syeikh Abu Mas'ud Abdullah bin Mas'ud Al-Jawi, whom he met at Aden, Yemen around 1328. It's a proof that Islam and Sufism had established in the island of Java at that time, probably among the merchants and nobles. Walisongo was actually a council of Sufi masters which always consist of nine members. If one member died or moved abroad, he would be replaced with a new one, elected by the remaining members.

Revolt in Majapahit

Majapahit kingdom was at its decline at that time. Many vassal states and provinces had tried to break free from them. Two of them were the kingdom of Daha and the kingdom of Blambangan in the easternmost part of Java. Blambangan was less powerful than Daha, so Majapahit reacted by sending a large army to this region which they considered easier to deal with. King of Blambangan, Prabu Menak Sembuyu (Sadmuddha) which was also called in local folklore as Prabu Menak Jingga, led his army to the battle against Majapahit. Prabu Menak Sembuyu was killed in the war, but many of his followers fled to Giri and seek protection from Sunan Giri, who was the grandson of their king.

The army of Majapahit then planned a second attack, but this time to Giri, to eliminate the remnants of the Blambangan army who fled there. Before they could reach Giri, Sunan Giri defeated them in a war by using mystical power as was described in "Babad Tanah Jawi" manuscript. The Majapahit army retreated to Trowulan, chased by Sunan Giri's followers. The table was turned, this time it was Majapahit which was under siege. Before the war became more violent, Sunan Ampel ordered Sunan Giri to hold his army and made a truce with Majapahit. Sunan

Ampel didn't want Majapahit to be destroyed because they had been very tolerant with the growth of Islam in Java. Furthermore, there were many nobles and officers in Majapahit who already embraced Islam. In the truce, Giri was given autonomy under the kingdom of Majapahit and so was Demak. Bhre Kertabumi, king of Majapahit, also adopted Raden Hasan as his son, so that he wouldn't avenge his father's death. The position of Walisongo became stronger and Majapahit was no longer a threat to the spread of Islam.

The political situation was unpredictable at that time since there were still rebellions against Majapahit in many area which could endanger further spread of Islam. This condition forced Sunan Ampel to renew his strategy in managing the Walisongo. Sunan Ampel had also made contact with Syarif Hidayatullah, a Sufi Master from Cirebon, an important seaport of Pajajaran kingdom, rival of Majapahit in West Java. Syarif Hidayatullah was an important person because he was the nephew of Pangeran Cakrabuana, ruler of Cirebon. He was also grandson of Prabu Silingawi, king of Pajajaran, so the Hindu generals of Pajajaran didn't dare to disturb the Moslem community in Cirebon. Syarif Hidayatullah was later known as Sunan Gunung Jati. To strengthen the Moslem power in Java, Sunan Ampel invited Syarif Hidayatullah to join the council of Walisongo, and the formation became like this:

"Sunan Ampel still led the council and managed Ampel, Canggu, and Jedong.

"Raden Makdum Ibrahim was pulled from Daha and was assigned to manage Bonang, near Tuban. Raden Makdum Ibrahim then was titled Sunan Bonang.

"Raden Qosim or Raden Alim was pulled from Majagung and was assigned to managae Drajad, also near Tuban, to replace Raden Mahmud. His position in Majagung was replaced by Syekh Sulayman. Raden Qosim was titled Sunan Drajad.

"Raden Ainul Yaqin or Raden Paku managed Giri. He was titled Sunan Giri.

"Raden Fatah managed Demak area. He was titled Sunan Demak.

"Syarif Hidayatullah managed Cirebon and regions in western Java. He was titled Sunan Gunung Jati.

"Syekh Abdul Jalil managed Lemah Abang, Pajang. He was titled Syekh Lemah Abang or Syekh Siti Jenar.

"Usman Haji still preached at Ngudung, Matahun, and had the title Pangeran Ngudung and also Sunan Ngudung.

"Raden Hamzah was pulled from Tumapel and was assigned to preach in Lamongan. Raden Hamzah was titled Prince Lamongan and also Sunan Lamongan.9

The new formation put all member of Walisongo at every important seaports in Java. The strategic locations, with the help from Moslem merchants, enabled them to gain more control to the economic system of the island and strengthened the position of Walisongo and the Moslem communities. The economic control in the northern seaports and the strong military power in Demak and Giri, were needed to anticipate the political heat in Majapahit. 10 For centuries, the Javanese Moslems were always protected under the rule of Majapahit, which was tolerant to them, while most of the rebels didn't like Islam. Should anything happened to Majapahit, Walisongo were already prepared to build an independent state, the first Islamic kingdom in Java to protect the growth of the new religion. It's sad to know that many orientalists claim that the economic and worldly benefit which the rulers had by embracing Islam is the cause of their conversion to the new religion. This opinion should not be accepted and it's a reflection of the orientalists' bad prejudice to Islam. Actually it was Sufism who helped getting Islam into the hearts of the first converts of Indonesian Moslems. The Sufism teachings of love and asceticism had penetrated the mystic-minded royal courts, while their teaching of equality of all human before Allah had absorbed the commoners who were placed low in the caste-system of the Hindu kingdoms.

Reference:

1. Journal of Faculty of Arts, Gauhati University, Vol.XL (2004-5) pp120 The Origin, Development and Meaning of Sufism: Mazhar Asif

2. Encyclopedia of Islam, Vol.111,pp 347

3. The Mystic of Islam: pp 70

4. Howell, Julia Day. "Modernity and Islamic Spirituality in Indonesia's New Sufi Networks." In Sufism and the "Modern" in Islam, edited by Martin van Bruinessen and Julia Day Howell, 217-40. London: I. B. Tauris, 2007 pp.45

5. Ernst, Carl W., and Bruce Lawrence. Sufi Martyrs of Love: Chishti Order in South Asia and Beyond. New York: Palgrave Macmillan, 2002.pp.56

6. Howell, Julia Day. "Sufism and the Indonesian Islamic Revival." Journal of Asian Studies 60, no. 3 (2001): pp.29.

7. In Expressing Islam: Religious Life and Politics in Indonesia, edited by Greg Fealy and Sally White, pp. 62. Singapore: ISEAS Press, 2008.

8. Howell, Julia Day. "Indonesia's Salafist Sufis." Modern Asian Studies 44, no. 5 (2010): pp. 51.

9. http://archives.digitaltoday.in/indiatoday/20020325/society.html (accessed 25 January 2009).

10. Ernst, Carl W., and Bruce Lawrence. Sufi Martyrs of Love: Chishti Order in South Asia and Beyond. New York: Palgrave Macmillan, 2002.pp.60

Bibliography:

1. Arberry, A. J. Sufism. London: Allen and Unwin, 1950.

2. Arberry, A. J. The Doctrine of Sufis Allen and Unwin, 1950.

3. Hastings, James (1921): Encyclopaedia of Religion and Ethics, VOL. XII, Columbia University ,New York.

4. Nchoson R.A ((2009): The Kashfu Al Mahjub; Adam Publishers & Distributors; New Delhi-110002

5. Raudvere, Catharina, and Leif Stenberg, eds. Sufism Today. London: I. B. Tauris, 2009.

6. Schlegell, Barbara van. "Translating Sufism." Journal of the American Oriental Society 122, no. 3 (2002): 578-86.

7. Sedgwick, Mark. Against the Modern World: Traditionalism and the Secret Intellectual History of the Twentieth Century. Oxford: Oxford University Press, 2004.

8. Subhan A John ((1999): Sufism , Its Saints and Shrines; Indigo Books: Cosmo Publications; New Delhi-110002, India.

9. SUFISM//Sufism-Wikipedia, the free encyclopedia.htm#cite_note-2.

☆☆☆

Dr. Salina Begum Laskar

Guest faculty, Department of Persian, Gauhati University

Tagore and Iqbal: Purushottama and Mard-e-Kamel

Abstract

In the present article the authors have carried out a Comparative Study of Philosophy of Dr. Mohammad Iqbal and Rabibdranath Tagore. This is perhaps the first time where an attempt has been made to compare both these renowned scholars. They are the torchbearer of action and progress. Both are interpreter of mysticism and beauty. They have given much importance to religion and spirituality. They have full faith in God. For them place of man is above every creatures. Life and death are continuous process. Iqbal has laminated his philosophy with poetry however Tagore does not sing to propagate rather he speaks out whatever are in his mind. Iqbal acts like a prophet in his poetry. His main goal of composing poetry was to bring moral and religious renaissance in the society. Other hand Tagore is very open. He does not compose poetry to advocate any reform in the society. Iqbal had a revolutionary mind and believed in awaking the people by shaking them so that a new society can be formed. Tagore was peace loving but Iqbal loved revolution. Tagore introduced romanticism in the life of the people but Iqbal gave lesson of courage and bravery. There was music in Tagore's poetry but Iqbal's poetry has suffering of human beings, pain and flame. Tagore got Nobel Prize in 1913 but Iqbal did not get a single prize in his entire life. Tagore naturally was soft spoken and kind hearted but Iqbal was a revolutionary. Tagore lived a comfortable happy and prosperous life and died at the age of 80. Iqbal lived a life full of struggle and died at the age of 60. my humble effort in this article is not to compare these two great poets but we have tried our best to evaluate their works, thoughts and philosophy so that their position, place and important can be fixed and determined.

Introduction:

The word comparison appears to be very simple and easy but in reality it is very complicated and complex issue because it creates so many complications and difficulties. Despite that comparative study has been an interesting work where so many aspects come to light in regard of a particular artist which did not exist before the study. However If the comparison is between two artists belonging to the same language then it is little bit easy but if the comparative studies is between two artists belonging to two different languages then it is more difficult. As we know every artist has his individual quality and inadequacy. What so ever may be the Comparative study itself is very interesting topic because it brings out common thinking of two greatest and different artists. Admittedly there is no comparison at all between Iqbal and Tagore. They also did not want to be compared. Both of them have unique personality and identity therefore they cannot be compared. However, since they lived in the same period therefore a lot of similarity and dissimilarity are found in their poetry and thought. When Tagore came to know about theory of comparison between him and Iqbal, in a letter to his friend Dr. Abbas Ali Khan Lame dated 7th February, 1922, he not only accepted greatness of Iqbal but also ended the controversy of being compared. He writes, "I am sure, both I and Sir Mohammad Iqbal are comrades working for cause of truth and beauty in literature and meet in a realm where the human mind offers its best gifts to the shrine of the eternal man".1 Tagore and Iqbal were great poets and philosophers of the same period. They were very eager to see each other but their dream was never fulfilled. There was respect for each other in their heart. Tagore in a lecture said the following words about Iqbal: "Iqbal wanted to carry human beings to the highest point of this world through his poetries. My goal is also service of humanity. Since the period of Upnishada till date the spiritual leaders have taught us to develop our character. Iqbal , through his poetry and philosophy has done the same thing"2. Though Iqbal is best known as an eminent poet, he is also a highly acclaimed "Muslim philosophical thinker of modern times. He is considered as last pioneer of the Persian Literature in the sub-continent. Rabindranath Tagore occupies a frontal position in the galaxy of the prophets of Humanism. Commonly known as Gurudev,

is the first non-European Nobel laureate who earned the Novel prize in Literature in the year 1913 for his work Gitanjali .

Tagore & Iqbal: Introduction of Tagore and Iqbal is that one person was born on 7th May, 1861 in Kolkata and other was on 9th November, 1877 in Sialkot. One was expert in Urdu, Hindi, Persian, Arabic and English the other was great scholar of Bengali, Sanskrit and English. Both of them were born in a period when the entire nation stood against the Britishers. In a result both of them infused feeling of nationalism into the mind of public through their own unique and individual style. Hence both the poets have individual quality which was reflected in their works and thoughts throughout their life. Their family background and social environment also played very important rules in shaping their own unique ideology and identity. Both of them belonged to Brahman family. Forefathers of Iqbal were Brahman of Kashmir origin who converted to Islam. Though Tagore was born in a Hindu family but his mindset was totally different from other Hindu. The custom and manner practiced in his family were completely different from other Hindu family. His grandfather Dwarika Nath and father Debendra Nath were firm believers in the philosophy expounded by the founder of Barhamo Samai, Raja Ram Mohan Roy (1774-1833) and were ardent preachers of his ideology. The Bengali translation of the holy Quran by Girish Chandra and his other books written on Islam gave an opportunity to the Bengali Hindu to understand Islam and its culture. It is quite understood that Tagore might have taken advantage of those books. Besides this there has been tradition of Persian culture in the family of Tagore since very old age. He, from his childhood, was enamoured of Iran, the Iran of legendry heroic men, great culture and classical poets. As a boy, he often used to listen to his revered father, Maharishi Debendranath (1817-1905), who, intoxicated with Hafez's verses, recited these poems in Persian and later translated them to him with great fervour of enjoyment. His father knew most of the ghazals of Hafez by heart and used to recite them with great pleasure and felicity and, it is said, when he was on his deathbed he requested that one of his favourite's ghazals of Hafez be recited. Someone recited the ghazal which begins with the following verse:

"O cupbearer! Draw the cup, fill it up and pass it round the ring.

For love appeared easy in the beginning but the end of it was very hard"3.

All this left a deep impression on Tagore's heart. The poet says in his own words:

"My father was a great scholar. He was intoxicated with Hafiz verses. When I was a boy I often used to listen to the recitation of those poems, and he translated them to me with fervour of enjoyment that touched my heart. The vision of Persia was invoked in my imagination by the voice of your own poets, who brought to my mind's sky the breath of your spring breeze with the enchantment of its blossoming roses and nightingales' songs. My arrival in your land today is therefore a continuation of the same enchantment and I am glad to mingle my voice with the rejoicing of life which has broken out in the air of your beautiful country fragrant with the perfume of orange blossoms"4. Iqbal and Tagore both are great poets and spiritual ambassadors of India. Both of them were desired to bring renaissance into the mind of the people. Both of them sang song of freedom. One is creator of JAN GAN MAN ADHINAYAK JAI HAI and other one is poet of SARE JAHAN SE ACHA HINDUSTAN HAMARA. But unfortunately none of them saw an independent and sovereign India.

Origin of Tagore's Philosophy: Rabindranath is a mystic philosopher. It is mysticism which is the very core of his philosophy. Tagore's ideology comes from the teaching of the Upanishads. He was greatly influenced by philosophy of Vedanta, religious movement of Rajaram Mohan Roy and literary movement of Bankim Chandra Chatterji . He was also very fond of Sufism and Iranian poetry and often appreciated the charm of Hafiz's ghazals. Tagore like Hafez Shirazi was intoxicated in love of God. Like his father, he sought love, peace and beauty and could find it only in the leafy, lush green, fragrance of flowers, chirping of birds, and cool breeze of the abode of peace. It is this commitment of love, peace and beauty that brings Tagore closer to the three great poets of Iran: Sadi Shirazi, Hafez Shirazi and Jalaludin Rumi and to the Iranian mystic thought. This closeness of thought was not a coincidence-rather it has been the result of Tagore family's long association with Iran, its poetry and its poets. Tagore himself acknowledges that his poetry has an imprint of Persian Sufistic ethos. "My poetry is believed to have affinities with Persian Sufism"5.

Origin of Iqbal's Philosophy: There are three sources of Iqbal's philosophy (1) the Quran (2) the Muslim Philosophers and mystics and (3) the western philosophy and science. But he developed his own philosophy after amalgamating the west with the east. He discussed the fundamental principles of Islam in the light of modern thought and scientific knowledge and made a searching analysis of its basis. Undoubtedly he accepted divergent views expounded by the western philosophers and thinkers but the soul of his philosophy lies in the Islam. He made a serious attempt at seizing with the problems of modern western philosophy within an Islamic context. He, in this endeavour, was inspired by western thinkers like Nietzsche and Muslim spiritual teachers like Mohammad Ibn al Arabi and Jalaluddin Rumi. Love of God and Khudi are the main theme of his philosophy around which all his poetry revolves. He gave expression to a humanitarian message with a universal appeal, uncontrolled by temporal limit. His message of passionate love, intense devotion, complete humility, universal brotherhood and humanitarian values holds true for all times and all peoples. In his opinion, Khudi is all omnipresent like the Atma of Advaita philosophy which contains the entire Cosmos within itself. Iqbal says:

"The self resides in you, just as the infinite sky with all its vastness is contained in the pupil of the eye"6.

Philosophical differences: Iqbal has written that "difference between Tagore and me is that he propagates silently but works practically. Where I talk about action but observe easy life."7 The basic difference between Iqbal and Tagore is of their philosophy and thought. Tagore was follower as well preacher of Wahdatol Wajod. He believed that God is inside us. His philosophy was called concrete Monoism. In Tagore truth and God are one. His God was in fact Ishwar as well as Porush which he named as Jiwan Dewta. Iqbal has laminated his philosophy with poetry however Tagore does not sing to propagate rather he speaks out whatever are in his mind. His goal is not to give moral teaching. Iqbal acts like a prophet in his poetry. His main goal of composing poetry was to bring moral and religious renaissance in the society. Other hand Tagore is very open. He does not

compose poetry to advocate any reform in the society. Whatever he has in mind it comes out in the form of poetry. His goal is not to give moral teaching. Iqbal is poet of life and existence. He deeply believed in humanism and tried his best to raise position of man by inculcating spirit of God into him. Iqbal had a revolutionary mind and believed in awaking the people by shaking them so that a new society can be formed.Tagore was peace loving but Iqbal loved revolution. Tagore introduced romanticism in the life of the people but Iqbal gave lesson of courage and bravery. There was music in Tagore's poetry but Iqbal's poetry has suffering of human beings, pain and flame. Both of them out rightly rejected monastic life and considered facing the problems of life with courage as sigh of complete man.

Khudi or Self is not Tagore's area but the entire topics related to human beings are fully covered by him. Iqbal said that life is not so ordinary that it will be finished on the occurrence of death. Death is actually one stop in the continuous way of life. In contrast Tagore in Gitanjali wants to meet God by leaving his life. In the poetry of Tagore spiritualism and philosophy are found in abundance. But Iqbal has elaborated our every aspect of life. Iqbal uses jargon and philosophical words but Tagore expresses himself with great delicacy and purity. In the poetries of Tagore we find a stream of philosophy and spiritualism. But in Iqbal everything is not spiritualism. Rather he is also critic of different aspects of life. Tagore was in support of literature for literature but Iqbal literature for life. Tagore presents his ideology in a supplicate way the same was put forward by Iqbal in a radical way. Iqbal invites the oppressed people to fight against the injustice and inequality muted against them by the rich people. But Tagore advocates for international love and mutual understanding. The final goal of their journey is same. They are poet of motion and action. Tagore is more poet than a philosopher. In contrast Iqbal is both a poet as well as a philosopher.

Religious differences: There are great differences of religious view expressed by these poets. Iqbal was in opinion that the religion never teaches discord and conflict but according to Tagore religion is root of all conflict and dispute. Tagore was Hindu and Iqbal Muslim. But none of them were

fundamentalists. They are contemporary and belong to one country but they belong to different cultural and linguistic back ground. Despite of these differences when we study their works we were surprised to find that much poetry written by them have common subjects. Both of them make the people aware about the misinterpretation and misuse of religion by the Molla and Pandit. Both of them raised banner of revolt against old exhausted tradition and custom. Both of them were in love with humanism. They have sung song of humanism.

Concept of God: Both Tagore and Iqbal are madly in love with God. Their concept of God is the one and only, the Eternal and Absolute. He is near us. He cares for us. We owe our existence to Him. He is the only God to whom worship is due. All other things that we can think of are His creatures and in no way comparable to Him. He is neither born nor does He give birth to anybody. There is no person like Him. His qualities and nature are unique. He is Eternal, without beginning or end. He is not limited by time or place or circumstances. It is He who has created all things that are on earth for us. This universe is the expression of His extra-ordinary power of creation. Iqbal lends supports to the idea of God as transcendent Being since it is in conformity with the Quranic teachings. But he is a qualified pantheism because the Deity or the All-soul does not merely penetrate through the universe, but the latter is His creation as well. It is thus obvious that Iqbal is a sort of pluralist theist, steering his way clear of the two extreme modes, and lends his fullest support to the idea of the creator and the created as distinguishable and separable from each other and the Absolute Ego and the finite Ego as two discrete entities.

He says:

"These poor Gods are made of stones and bricks;
There is a superior Being away from the Temple and Sanctuary.
Prostration without the inclination to act is dry and does not reach its goal;
Life is all character, be it fair or evil.
I'll tell you clearly what no one else knows:
Happy is he who engraves it on his heart.

The world that you see is not under God's influence;

The spinning wheel is yours, and so is the thread woven at your spindle.

Bow down to the charter of the consequences of action;

Since it is from action that Hell, Purgatory and Heaven arise.'8

According to Iqbal, God is perfect and benevolent. He possesses all the metaphysical, moral and causal attributes. God possesses a perfect knowledge of all things- past, present and future. The metaphysical attribute of God indicates his omnipotence, omniscience and omnipresence. Man is always accompanied by God who guides him when he is in happiness or pain.

God is knowledge but he cannot be known as things of the world. The worldly things can be experienced by our intellect but it is not able to have the knowledge of God. "The vision of the supreme one in our own soul is a direct and immediate intuition, not based on any ratiocination or demonstration at all."9 Tagore believes in the immanence of God. Tagore never defines God in negative term. He describes God by calling him the sky, the seed, the tree and so many other things. The God of Tagore is not nameless and formless. He reflects himself in death and immortality. According to Tagore God can be found through personal purity and service to others. Tagore is not an escapist. He believes in detachment, asceticism and deliverance but all these are counterbalanced with his love of humanism. He is not a staunch believer of renunciation of world of senses. He believes that relationship of soul with God, needs the relationship with the man. Tagore says that the God lies among the human beings. He is in you, me and every living being so to love everyone in this world is to love the Almighty and to serve mankind is to serve the Supreme, Immanent will. God is not to be found in the temple but with the lowest and humblest. Since God dwells in the inmost shrine of the heart, one has to keep away all evils from one's heart. Our effort should be to reveal God in our actions because it is God who gives us the power to act. This is true worship. In our relationship with the divine what is important is the total self-surrender so that we may accept God as everything. A humble devotee prays:

This is my prayer to thee, my Lord-strike, strike at

the root of penury in my heart.

Give me the strength lightly to bear my joys and sorrows.

Give me the strength to make my love fruitful in service.

Give me the strength never to disown the poor of

bend me knees before insolent might

Give me the strength to raise my mind high above

daily trifles;

And give me the strength to surrender my

strength to thy will with love.10

The idea of a direct, joyful and totally fearless relationship with God can be found in many of Tagore's religious writings, including the poems of Gitanjali.

Where the mind is without fear and the head is held high;

Where knowledge is free;

Where the world has not been broken up into fragments by narrow domestic walls; ……..

Where the clear stream of reason has not lost its way into the dreary

Desert sand of dead habit; ……

Into that heaven of freedom, my Father, let my country awake.11

To the finite consciousness God is far away; to the religious soul He is quite near. God is present, yet absent. Rabindranath says: "You were in the centre of my heart, therefore when my heart wandered she never found you."12

In the characterizations of God in the Vedanta writings and Rabindranath's works we find an identity of thought. The popular idea that Brahman of the Vedanta is an abstract beyond is incorrect. Rabindranath protests against such a misconception. He says: "The infinite in India was not a thin nonentity, void of all content. The Rishis of India asserted emphatically, 'To know Him in this life is to be true; not to know Him in this life is the desolation of death.' How to know Him then? 'By realizing Him in each and all.' Not only in nature, but in the family, in society, and in the state, the more we realize the world-conscious in all, the better for us. Failing to realize it we turn our faces to destruction."13 He says that the Lord walks in the midst of the poorest the lowest and the lost people who have no hopes

and the Lord is there with them to love and take care of them. He himself feels that he has pride and he can never find his way towards the ways of the Lord. He feels he has to become good and try to overcome the pride and only then he can follow the Lord, as his self pride is seen as a hindrance in his love for the Lord. In one way he tries to address to those people who have pride of wealth and standard to correct them to share the love and be humane to the needy people and let everyone leave in peace and harmony. So the poet writes:

When the heart is hard and parched up, come upon me
with a shower of mercy.
When grace is lost from life, come with a burst of song.
When tumultuous work raises its din on all sides
shutting me out from beyond, come to me, my lord of
silence, with thy peace and rest.
When my beggarly heart sits crouched, shut up
in a corner, break open the door, my king, and come
with the ceremony of a king.
When desire blinds the mind with delusion and dust,
O thou holy one, thou wakeful, come with thy light and
thy thunder. 14

Marde Kmel or Purushottama: The Idea of Perfect Man, is not unfamiliar. Jalaluddin Rumi, a great mystic poet of Persian Language, is probably the first Muslim thinker who has presented a complete picture of Perfect Man. There are other Muslim scholars who also put forward theories of Perfect Man. Ibn-i-Muskwaih had undoubtedly initiated the idea which found its culmination in Rumi. Iqbal through his philosophy- Khudi- conveys a clear cut message to his readers and he is in search of Marde kamel who was having all qualities of God. But Tagore is in favour of complete surrender before God. His man is weak, defeated and frustrated who lives on the mercy of God. But man of Iqbal is brave and wants to inculcate quality of God into his heart. Perfect Man is blend of Ishq and Intellect. He has not fear and no difficulty can upset him. Also death cannot frighten him because of the developed state of ego. Physical death looks pleasant to him.

Iqbal says:

What is the sign of the faithful man,

When death come, he has a smile on his lips.15

Iqbal decisively considers that higher than Heaven is the place of man. Man is the superior of the creatures. God wanted to be recognized so He created man. This Universe and whatever is in it all are created by God for man. Therefore, Iqbal in a very clear and loud voice emphasizes on maintaining identity and individuality of man. He says:

"Will there remain any luster in the sun,

If it is fed up with its rays"? 16

He gives stress again and again that man can redeem his honor only by maintaining dignity of Khudi. He thinks that man should shine with his own light, not with the borrowed one. He can make himself eternal only by strengthening his self. He addresses man and says, 'do you know what is secret of life? And answers, "life is liberating oneself from circumambulation of others and regarding himself as the house of God".17 Iqbal gives central position to man in the universe. Man is co-worker with God. He advises man raised your Self so high that before every verdict God Himself may ask you: what is your desire. From humanist point of view it is the best tribute paid to man as he has been made master of his own destiny.The man himself is the architect of his fate. He can make either paradise or hell for himself, since the power of choice rests with him. While establishing supremacy of man he argues with God:

"You created the night my master,

and I lighted the lamp

From the poison I extracted the antidote

and carved a mirror from the stone

Tell me sincerely, oh my Creator!

Who is greater you or me?"18

Iqbal beautifully says in Bal-e-Jibril that:

A Perfect Man's arm is really God's Arm,

Dominant, creative, resourceful, efficient.19

In Tagorian philosophy the concept of man has occupied an important role. Tagore's view concerning the possibility of knowledge is based upon his

anthropology that man is not enough unto himself, he realizes his own self more fully when he succeeds in relating himself to the world at large. Man can be considered as a self-interpreting creature and he grows and changes through his re-interpretation and re-understanding of himself. For living as a perfect being in this human society he needs some values, virtues and ideals. All these are the integral part of human being. Rabindranath Tagore called these things as "Surplus in Man".20

Iqbal through his philosophy- Khudi- conveys a clear cut message to his readers and he is in search of Marde kamel who was having all qualities of God. But Tagore is in favour of complete surrender before God. He does not want to create his own world. His man is weak, defeated and frustrated who lives on the mercy of God. But man of Iqbal is very bold and talks to God like a friend and beloved.

Prem &Ishq: Near Tagore Love is unconditional and complete submission where in Iqbal lover and beloved have friendly relation. Pain of separation is found in their poetries. Tagore and Iqbal both are in favour of hiding the pain of Love. Iqbal wanted that this pain should be kept hidden in the bottom of our heart. Tagore desires that this gift in the form of heart silently should be offered to God. Love of Tagore is nourished and cultivated in the attractive environment of village. The background of his poetry is village. The beloved of his poetry is an innocent girl who leaves in village on the bank of a river. Tagore says in Gitanjali:

"I am only waiting for love to give myself up at last
into his hands. That is why it is so late
and why I have been guilty of such omissions.
They come with their laws and their codes
to bind me fast; but I evade them ever,
for I am only waiting for love
to give myself up at last into his hands.
People blame me and call me heedless;
I doubt not they are right in their blame.
The market day is over and work is all done

for the busy. Those who came to call me in vain
have gone back in anger. I am only waiting for love
to give myself up at last into his hands."21

The place of God, as regarded by Iqbal, is the human heart. It is love that purifies the heart, cleans it up, clears it from wordily rubbish, and makes that heart a worthy place for God. According to Iqbal the salvation of the inhabitants of this earth lies in love. Khudi is strengthened by Ishq (love). Khudi is radiant point. It is made more lasting, more living, more burning and more glowing by love. The beginning of the journey to the self is love and the end is Beauty. Iqbal says:

"The luminous point whose name is the self
Is the life-spark beneath our dust?
Love fears neither sword nor dagger,
Love is not born of water and air and earth.
Love makes peace and war in the world,
Love is the fountain of life,
Love is the flashing sword of death.
The hardest rock are shivered by love 'glance,
Love of God at last becomes wholly God.
You learn to love and seek a beloved"22

Iqbal and Tagore lay great emphasis on love. Just as God created the universe not out of necessity but out of joy and love, so should man strive to attain freedom from self through love. It is in action that we tend to manifest our nature. Tagore gives the example of a mother, who "reveals herself in the service of her children, so our true freedom is not the freedom from action but freedom in action, which can only be attained in the work of love"23. He brings out the distinction between maya and truth, in that maya is the self separate from God, while love is truth or satyam. Man has to discard his selfish desires which hang on to him as his second skin, seeming to be his very nature. But once he starts giving in love then he finds fulfilment in that as is his true nature. Therefore when the self sees itself in isolation from the soul as the absolute it lives in futility. But it becomes satyam

when it recognizes its essence in the universal and the infinite:

Tagore discuses at length the quality of love adding that the world is born out of love, that it is sustained in love, that it moves towards love, and finally enters into love. It is love that enables man to transcend all limitations as at the same time it is his love of life that urges him to continue his relation with this great world24. Only love can harmonize the opposing principles of creation that of unity and diversity, loss and gain, personal and impersonal, bondage and liberation. Love is not a product of compulsion but of joy. And this joy which is manifest in creation, "is the realization of truth of oneness, the oneness of our soul with the world and of the world-soul with the supreme lover"25. Tagore, therefore, equates love to joy that in turn is equated to God.We find the echo of this thought in Tagore:

"My world is aflame with love: we believe that this world is temporary but it is love and love alone that is eternal."26

Tagore also takes pleasure in love's pain and says:

"Yes the God of love has given us the pleasure of pain,

Our nights of meeting with the beloved do not need any other ornamentation."27

Rabindranath's love is a spiritual love above sex, unintelligible to the world at large, a love which loses itself in the sea of the Absolute to "melt and vanish away in the dark, or it may be in a smile of the white morning, in a coolness of purity transparent,"28Iqbal has broadened the meaning of 'Ishq. For Iqbal 'Ishq is assimilation and absorption. He says that it "means the desire to assimilate, to absorb. Its highest form is the creation of values and ideals and the endeavor to realize them. Love individualizes the lover as well as the beloved. To Iqbal everything is in a state of love or there is force of love behind everything."29

Reference:

1. Qaumi Raj, Iqbal number, Mumboyi, December 1977,pp 34
2. Yousaf Hussain Khan, Ruh-i-Iqbal, Delhi, 1962, pp.174
3. Indo-Iranica; volume-64, year-2011; p-15.
4. Ibid; p-32.

5. Indo-Iranica; volume 64, year-2011; p-2.
6. Bange Dara, Iqbal, p.18.
7. Glory of Iqbal, tr., Muhammad Asif Kidwai, p. 92.
8. Allama Iqbal: Javid Name, p-34.
9. Sadhana; p-36.
10. Gitanjali; poem-36.
11. The Argumentative Indian; p-98.
12. Fruit-Gathering; LXIX.
13. Sadhana, p.20; and Personality, pp.56-57.
14. Gitanjali; poem-39.
15. Iqbal, Bal-e-Jibril, (Lahore Taj Co., Ltd, 1935) p.24.
16. Iqbal, Bal-e-Jibril, (Lahore Taj Co., Ltd, 1935) p.26.
17. The Reconstruction of Religious Thought in Islam; p.53.
18. Asrar-e-Khudi; Iqbal, p.23.
19. http://www.amiqbalpoetry.com/ dated 20.01.2017 at 4.35.
20. Rabindranath Tagore:The Religion of Man (Eng. Version); P. 92.
21. Gitanjali; poem-17.
22. The Secrets of the Self; p.28-29.
23. Sadhana; p.78.
24. URL of the Issue: http://rupkatha.com/v2n4.php.
25. Ibid.
26. Indo-Iranica, vol-64, Numbers 3-4 (2011). P.5.
27. Ibid; p.7.
28. Gitanjali; 80.
29. R.A. Nicholson's trans., op.cit., p.29.

Bibliography:

1.Ashraf Ehsan, Dr.(2003): A Critical Exposition of Iqbal's Philosophy; Adam Publisher & Distributors 1542, Pataudi House, Daryaganj; New Delhi-110002.

2.Ayub, Abu Sayed, (1977): Adhunikata O Rabindranath; Deys publishing, 31/1 B, Mahatma Gandhi Road, Calcutta-9.

3.Gaikward, S.R. Dr. (2012): Rabindranath Tagore An Educational Philosopher; Pacific Publication, Delhi-110094.

4.Gupta Das Uma, (2010): Rabindranath Tagore: My Life In My Words; Penguin Books

India Pvt. Ltd, 11 Community Centre, Panchsheel Park, New Delhi 110017, India.

5.Hilal Dr. Aleem Abdul; (2003): Social Philosophy of Sir Muhammad Iqbal; New Delhi.

6.Iqbal Muhammad, (1986): Bal-e-Jibreel (Gabriel's Wing), in Kulliyat-e-Iqbal (Urdu), Karachi, Pakistan: Sheikh Ghulam & Sons Ltd, Ghazal 33, Verse 5.

7.Iqbal Mohammad Dr., (1990): Kulliyat-e-Iqbal; Iqbal Academy publications, Lahore, Pakistan.

8.Iqbal Mohammad Dr.; (2004) Multi Disciplinary Approach to Iqbal; Iqbal Centenary Symposium; New Delhi-110057. Iqbal Muhammad, (1959): Development of Metaphysics in Persia-a contribution to the history of Muslim Philosophy, reprinted by Bazm-e-Iqbal, Lahore.

9.Iqbal Muhammad, (1992): "McTaggart's Philosophy" in Thoughts and Reflections of Iqbal. Edited by Syed Abdul Vahid. Lahore, Pakistan: Sheikh Muhammad Ashraf.

10.Iqbal Sir Mohammad (2006): The Reconstruction of Religious Thought in Islam; Kitab Bhavan, Publishers, Distributors, Expoters & Importers 1784, Kalan Mahal, Darya Ganj, New Delhi-110002 (India).

11.Iqbal Muhammad Sheikh, (1920): Secrets of the Self; Macmillan and co, Limited st. Martin's Street, London.

12.Kazmi Hussain Latif Syed; (1997): Philosophy of Iqbal; (Iqbal and Existentialism); A.P.H. Publishing Corporation, 5, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002.

13.Kripalani Krishna (2012): Rabindranath Tagore - A Biography; UBS Publishers' Distributors Pvt. Ltd. 5 Ansari Road, Daryaganj, New Delhi-110002.

14.Nicholson, R.A., (1920): The Secrets of the Self (English Translation of Asrar-e-Khudi); Macmillian and Co., London.

15.Radhakrishnan Sarvepalli, (1918): The Philosophy Of Rabindranath Tagore; Macmillan And Co., Limited St. Martin's Street, London.

16.Sen Amartya, (2005): The Argumentative Indian: Writings on Indian Culture, History and Identity; Published by the Penguin Books Ltd, 80 Strand London WC2R ORL, England Penguin Group (USA), Inc., 375 Hudson Street, New York, New York 10014.

17.Sahu Monideepa (2013): Rabindranath Tagore : The Renaissance Man; Penguin Books India Pvt.Ltd, 11 Community Centre, Panchsheel Park, New Delhi 110017, India.

18.Syed Abul Hasan Ali Nadwi, (1973): Glory of Iqbal, tr., Muhammad Asif Kidwai, Islamic Research and Publications, Lucknow (India).

19.Sen, A., (2006): The Argumentative Indian: Writings on Indian History, Culture, and

Identity (1st ed.), Picador.

20.Sharif, M. M., "Iqbal's Conception of God" in The Reconstruction of Religious Thought in Islam. Edited by M. S. Sheikh. Lahore, Pakistan: Iqbal Academy Iqbal as a Thinker (Essays by Eminent Scholars), Lahore, Pakistan: Sheikh Muhammad Ashraf, 1973.

21.Tagore, Rabindranath (2010): Gitanjali (Bengali): Good Book Distributors & Publishers, Kolkata.

22.Tagore, Rabindranath, (1961): Europe Jatrir Diary, Calcutta: Visva-Bharati.

23.Thompson,Edward J., (1921): Rabindranath Tagore: His Life And Work; Y.M.C.A. Publishing House 5 Russell Street, Calcutta-16.

24.Tagore,Saumyendranath, (2006): Rabindranath Tagore: Philosophy of Life and Aesthetics; First Edition, Published by: Ajit Kumar Jana, Mahatma Gandhi Road Kolkata-700009, India.

25.Tagore, Rabindranath, (1913): Sadhana: The Realisation of Life, London: Macmillan.

26.Tagore, Rabindranath, (1933): My Reminiscences; Translated by Surendranath Tagore, London: Macmilllan.

27.Tagore, R.N., (1975): The Religion of Man; George Allen & Unwin Ltd, Ruskin House, Museum Street, London.

28.Tagore, Rabindranath, (1970): Personality; Macmillan & Co.Ltd. Calcutta.

29. Tagore, Rabindranath, (2011): Gitanjali (English); Eighteenth Reprint, UBS Publication and Distributor Pvt. Ltd, New Delhi.

30.Tagore, Rabindranath, (1967): Rabindra-Rachanabali; (Collected Works), volumes I-XXVIII, volumes I-XXVII, 1346-72 (1939-65), volume XXVIII, 1402 (1995) Calcutta: Visva-Bharati.

31. Tagore, Rabindranath, (1991): Rabindranath Tagore: Poet and Dramatist, Reprint, New Delhi: Oxford University Press.

32.Tagore, Rabindranath, (1965): Rabindra Rachanabali, Vol-IV (Chitra:Jivan devata) , Dwarakanath Tagore Lane, Calcutta.

33.Tagore, Rabindranath, (2011): Gitanjali (English); Eighteenth Reprint, UBS Publication and Distributor Pvt. Ltd, New Delhi-110002.

34.Tagore, Rabindranath, (1361): Gitanjali (Bengali); Visava-Bharati, 6/3 Dwarakanath Tagore Lane, Calcutta-7.

35.Tagore, Rabindranath, (1970): The Religion of Man (Eng. Version), Unwin Books, London.